10/1971

دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی مجلہ

ماہنامہ

الحق

زیر سرپرستی

شیخ الحدیث حضرۃ مولانا عبدالحق بانی و مہتمم دار العلوم حقانیہ

اکوڑہ خٹک ضلع پشاور

پاکستان

لہ دعوۃ الحق

قرآن و سنّت کی تعلیمات کا علمبردار

فون نمبر دارالعلوم ۔ ۴ | فون نمبر رہائش ۲

جلد : ۷ | شعبان ۔ ۱۳۹۱ھ
شمارہ : ۱ | اکتوبر ۔ ۱۹۷۱ء

مدیر ——— سمیع الحق

اس شمارے میں

★

ناشر : سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ | طابع : منظور عام پریس پشاور

مقامِ اشاعت : دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ۔ | پرنٹر : محمد شریف

مغربی اور مشرقی پاکستان سے سالانہ ۸ روپے

غیر ممالک بحری ڈاک ایک پونڈ، ہوائی ڈاک ۲ پونڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
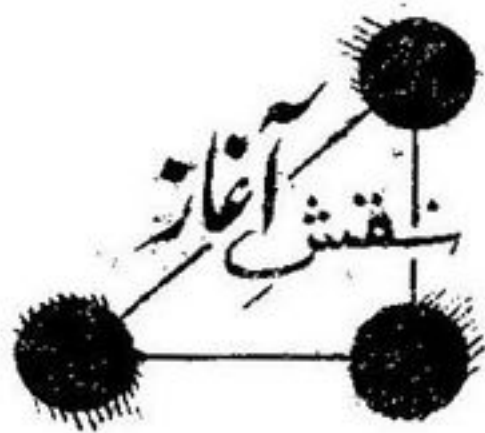
حیاتِ مستعار کا ایک اور ورق الٹ گیا۔ اور الحمدللہ کہ الحق نے اپنی زندگی کی ساتویں منزل میں قدم رکھا۔ الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات۔ انسان غلطیوں کا پتلا ہے۔ معلوم نہیں کہاں کہاں ٹھوکر لگی مگر جذبہ اور نیت ہر حال میں کلمہ حق اور اظہارِ حق رہا۔ علیمٌ بذات الصدور سے التجا ہے کہ لغزشوں سے درگذر فرما کر اس حقیر سی سعی کو سعیِ مشکور بنا دے اور توفیق دے کہ اگلا ہر قدم جادہ حق پر گامزن رہے۔ اور الحق کا نیا سال اس کے لکھنے اور پڑھنے والوں کی زندگی میں خوشگوار اضافوں کا باعث ہو۔ ربنا آتنا من لدنک رحمۃً وھیئ لنا من امرنا رشدا۔

قابلِ احترام عظیم دوست اور ہمسایہ مملکت ایران کی تحریک پر نہ صرف ایران و پاکستان بلکہ دیگر ممالک میں بھی ایران کی اڑھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کا جشن منایا جا رہا ہے۔ تقریبات کا ایک طویل سلسلہ ہمارے ہاں بھی شروع ہے۔ پورا پریس خاص ایڈیشن اور مضامین نکال رہا ہے سرکاری سطح پر دفاتر میں تعطیل کی گئی ہے۔ اور رنگا رنگ پروگراموں سے اس جشن کی رنگینیوں میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔

ایران ہمارا امن پسند پڑوسی اور ہمدرد ساتھی ہے۔ شاہِ ایران بالقابہ ہمارے مخلص اور غیور حلیف ہیں۔ پھر اسلام کے اٹوٹ بندھنوں نے ہم سب کو جسدِ واحد بنا دیا ہے۔ ایک کی خوشی سب کی شادمانی اور ایک کا غم سب کی بے چینی ہے۔ اس لئے بجا طور پر ہم شہنشاہ ایران اور ایرانی عوام کی مسرتوں میں شریک ہیں۔ ہم خلوص و وفا کا بدلہ خلوص سے دینا جانتے ہیں۔ اور انشاء اللہ ایرانی قوم ہر نازک مرحلہ پر ہمیں احسان شناس اور وفا شعار قوم پائے گی۔ پس بلاشبہ ہم اپنے دل کی گہرائیوں میں شاہِ ایران اور ان کے معزز خاندان بلکہ "اسلامی ایران" کے تمام بہادر اور محبِ ملت و وطن سپوتوں کیلئے جذباتِ تحسین موجزن پاتے ہیں۔

پس امید ہے کہ وفا کیشی کے اس واضح اعتراف کے بعد اسلامی تقاضوں اور جذبۂ ایمانی

سے مجبور ہو کر اس ڈھائی ہزار سالہ جشن پر ایک خاص زاویہ سے کچھ عرض کرنے کی جسارت کو کسی بُرے جذبہ پر محمول نہیں کیا جائے گا۔ مقصد نصح و خیر خواہی ہے۔ اپنے وطن عزیز کیلئے گرامی قدر ہمسایہ ایران کیلئے اور پورے عالمِ اسلام کے لئے اس لئے ان گذارشات کو بجذبۂ خلوص اور احساس مسئولیتہ خداوندی ہی پر محمول کیا جائے گا۔

دنیا کی تمام جاہلیتوں سے بیزار ہونے والے محمد عربی علیہ السلام کے نام لیوا بلا لحاظ اختلاف مسلک اگر غور کریں گے تو غیر شعوری طور پر اس اجتماعی جرم عظیم کی شدت اور گہرائی پر محو حیرت ہو کر اشکِ ندامت بہائے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ جو بے خبری میں اس جشن کی شکل میں سرزد ہو چکا ہے۔ اگر خدا نے چاہا اور یہ اشکہائے ندامت اس کی تلافی بن سکے تو اس خامہ فرسائی کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

بظاہر معاملہ کسی ایک خاندان کے جشن کا ہے مگر ہے تاریخ اسلام کی بھیانک ترین لغزش اور جاہلیت اولیٰ کی اتنی زبردست تحسین جسکی نظیر پوری تاریخ میں ملنی مشکل ہے ____ مسئلے کا ایک رخ تو یہ ہے کہ کیا اسلام نے شہنشاہیت کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ؟ اور کیا ملوکیت کی کوئی بھی شکل حضورؐ کے پیش کردہ نظام سیاست و مملکت سے جوڑ کھا سکتی ہے۔ ؟ دوسرا گوشہ یہ ہے کہ کیا اسلام نے کسی شخصیت، خاندان، کسی طبقہ یا کسی عہد یا تاریخ کے کسی خاص دور کا مروّج طریقوں سے جشن منانے کی اجازت دی ہے یا نہیں۔ ؟ اور کیا اسلام کا عمومی مزاج شہنشاہیت کی اس انداز میں روادار ہے؟ سلطانیٔ جمہور اور مساوات کے غلغلوں میں مسلمانوں کا ایسے نمونوں پہ قائم رہنا غیروں پر کیسے اثرات چھوڑ سکتا ہے۔ ؟ کتاب و سنت کی روشنی میں ان سب باتوں پر گفتگو کی گنجائش ہے مگر بات صرف اتنی نہیں اور نہ ہمارا روئے سخن ان چیزوں کی طرف ہے ؟ ذرا غور کیجئے یہ جشن اگر صرف سیادت مآب رضا شاہ پہلوی یا ان کے قریبی بزرگوں کا منایا جاتا یا اس سے بھی ایک قدم بڑھ کر اس کا دائرہ صرف سرزمین فارس میں آفتابِ اسلام کی ضیا پاشی کے آغاز تک وسیع ہوتا تو بمشکل سہی لیکن گنجائش شاید اس جشن کی نکل آتی اور اس حد تک ہم بھی جذبات سپاس و محبت میں شریک ہوتے مگر یہاں تو بات چودہ سو سال کی نہیں ڈھائی ہزار سال کی ہے۔ جس میں گیارہ سو سالہ دور خالص اس عہد جاہلیت کے شہنشاہوں کا ہے جب کہ اس پورے عرصہ میں ایران کی تیرہ و تاریک سرزمین کسی بھی آسمانی دین اور توحید کی روشنی سے شناسا نہ ہوئی نہ ان ملوک و امراء کے ہاں کسی اخلاقی قدر کی قدر افزائی تھی۔ پھر اس اڑھائی ہزار سالہ عہد میں ان ملوک کا وہ عہد تا مسعود بھی شامل ہے

جب کہ بعثت نبوی کے بعد خلافت راشدہ قریب الختم ہونے تک ان شہنشاہوں نے اپنی ساری قوت وسطوت اسلام اور داعی اسلام کے مقابلہ میں صرف کر دی اور ہر قیمت پہ اسلام کے تابندہ چراغ کو بجھانا چاہا مگر اسلام کے بہادر جرنیلوں نے سب کچھ لٹا کر یہ روشنی نہ صرف بچائی بلکہ ایران کے ظلمتکدوں کو اس سے روشن کر کے دم لیا۔ مگر اس روشنی سے پہلے ایران کی شب دیجور کی کیا حالت تھی، آئیے ظہور اسلام سے ذرا پہلے اور پھر اس کے بعد اس کی دھندلی سی تصویر پہ ایک نظر ڈالیں شاید تخت کیانی پر متمکن ان شہنشاہوں کے "کارناموں" میں بھی "جشن" کا کچھ سامان مل جائے۔

✦

بعثت نبویؐ سے پہلے ہمیں قباد اول بن فیروز سے واسطہ پڑتا ہے، جس نے مزدک کو پروان چڑھایا۔ مزدک نے دولت کے ساتھ عورت کو بھی مشترکہ قومی سرمایہ بنایا کسی ایک کی بیوی سب انسانوں کا بستر بن سکتی ہے یہ اس کا فلسفہ تھا۔ قباد نے اس تحریک کو شاہی سرپرستی میں لیا۔ عیش پرست ملوک اور امراء نے اس کا خیر مقدم کیا اور اس بہیمانہ تعلیم نے رہی سہی اخلاقی قدروں کو بھی خاک میں ملا کے رکھ دیا۔ ۵۳۱ء میں قباد کی جگہ نوشیرواں آیا جس کی عدل پروری کی دنیا میں ایک دھوم ہے۔ مگر عدل وانصاف کا یہ تمغہ اسے ان ہزاروں احباب و اقارب اور امراء وعوام کو تہ تیغ کرنے کے صلہ میں ملا جو اس کے کیش زردشتی اور جذبۂ آتش پرستی میں مزاحم بنے۔ الغرض اس نے مزدکیت کی جگہ زردشت کے نامعقول فلسفہ کو بزور شمشیر رائج کرنا چاہا۔ یہ فلسفہ کیا تھا؛ یزدان واہرمن کے نام سے خداؤں کی تقسیم، نیکی وبدی، خیر وشر، ظلمت ونور کا گورکھ دھندا، آگ اس میں مسجود خلائق تھی، رہا اخلاق تو اس پورے آئین اور فلسفہ میں اس کے لئے کوئی خانہ نہ تھا۔ بلکہ مجوسیت نے باپ کا بیٹی، بھائی کا بہن، بیٹے کا ماں سے نکاح کو ایک عام بات بنا کر اخلاقی قدروں کو پوری طرح محو کرنے کی بھرپور کوشش کی یہی وجہ ہے کہ پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں ہم بادشاہ یزدگرد ثانی کو اپنی بیٹی سے نکاح کرتے اور پھر اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کرتے دیکھتے ہیں۔ — نوشیرواں عادل کی اس دوئی پرستی (تثنی فی العبادۃ) کو اس کے بیٹے نوشزاد نے تثلیث پرستی سے مٹانا چاہا جو خود تثلیث میں محو تھا۔

نوشیرواں کے بعد یزدگرد ثالث سے لیکر ہرمز چہارم تک یہی حالت رہی بشہنشاہوں کے ان کے عہد میں عورت کا جو مقام تھا اس کے کچھ نقوش شاہنامہ کے اوراق میں نظر آسکتے ہیں۔—

اسی عہد کی یادگار مسیحیت اور مجوسیت کی وہ معجون مرکب بھی ہے جو مانویت کے نام سے مشہور ہے جس کی بنیاد یہ ہے کہ ترک ازدواج و تعلقات انسانی کے ذریعہ پورے بنی نوع انسان کی نسل کشی کی جائے۔ ان حکمرانوں میں قدر مشترک اگر تھی تو یہی کہ یہ اپنے بنی نوع انسانوں پر خدائی کیلئے پیدا ہوئے ہیں، رعایا انہیں معبود اور اوتار سمجھے اور وہ رعایا کو بے دام غلام جیسے بھی چاہیں ان کے مال و متاع اور عصمت و آبرو میں تصرف کریں۔ وہ اپنے سوا ساری مخلوق کو ذلیل اور کمتر سمجھتے اور اسے اپنے برابر کسی بھی انسانی سلوک کے مستحق نہ خیال کرتے۔ ہمارے ایک اولعزم سفیر مغیرۃ بن شعبہ رضی اللہ عنہ جب ایک دفعہ رستم کے دربار میں ساری شان و شوکت کو روندتے ہوئے تخت تک پہنچے اور رستم کے برابر بیٹھ گئے تو پورا دربار اس گستاخی پر چلا اٹھا اور مسلمانوں کے ایک معزز سفیر کو جنہیں بلایا گیا تھا۔ تخت سے کھینچ کر نیچے گرا دیا گیا۔ صحابی رسول ؐ نے شان قلندرانہ سے دربار پر ایک نگاہِ حقارت ڈالی اور فرمایا کہ اب تم ضرور مغلوب ہوگے۔ کیونکہ کوئی سلطنت ایسے افعال و اخلاق کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی۔

الغرض ان بادشاہوں کے ایسے عادات و اطوار تھے جنہوں نے مشرک عیسائیوں کو حضرت رسول کریم علیہ السلام کی نظروں میں مجوس پر قابل ترجیح بنا دیا تھا۔ قرآن کا سورہ روم بھی مسلمانوں کے ایسے ہی جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے۔
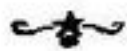
اب ذرا بعثت نبوی کے بعد ملوک فارس کے ردِ عمل کو بھی دیکھیے۔ حضورِ اقدس کا والانامہ دعوتِ نجات و فلاح لیکر حضرت عبداللہ بن حذافہؓ کے ذریعہ عظیم فارس کسریٰ خسرو پرویز کے پاس پہنچتا ہے۔ مگر وہ طرزِ تخاطب دیکھتے ہی آگ بگولہ ہو کر نامۂ مبارک پھاڑ دیتا ہے اور کہتا ہے: یکتب الیّ بھذا وھو عبدی۔ میرا محکوم ہو کر مجھے ایسا خط لکھتا ہے ــــ پھر نہ صرف یہ کہ قاصد کی تذلیل کر کے اسے نکلواتا ہے۔ بلکہ یمن کے گورنر باذان کو حضورؐ کی گرفتاری اور مدائن پہنچا کر دربار میں پیش کرنے پر مامور کرتا ہے۔ اور اسطرح حسب بشارت نبویؐ ہزار سالہ مستحکم سلطنت کی بنیادیں خود اپنے ہاتھ سے تہ و بالا کرنے کا سامان کرتا ہے اس کے بعد مدائن کے چودہ کنگروں کے گرنے کی تعبیر شروع ہوتی ہے۔ اور خسرو پرویز کا بیٹا نہ صرف اپنے باپ کو بلکہ تمام خاندان اور وارثانِ مملکت کو قتل کر کے تخت پر بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ تو اس کی جگہ سات برس کا بچہ اردشیر تختِ کیانی پر بٹھلایا جاتا ہے۔ مگر اپنے ہی ایک جرنیل کے ہاتھوں وہ بھی قتل ہو جاتا ہے۔

اور پورے خاندان میں مرد وارث تخت نہ ہونے کی وجہ سے کسریٰ کی بیٹی پوران کی تاجپوشی ہوتی ہے۔ مگر جلد ہی دور کا ایک رشتہ دار اسے قتل کرکے تخت پر قابض ہو جاتا ہے وہ بھی ایک ماہ سلطنت سلطنت نہیں اٹھاتا کہ اہل فارس اسے قتل کر دیتے ہیں۔ اب کسریٰ کی دوسری بیٹی ارزمیدخت کی باری آتی ہے اور وہ مالک تخت و تاج بن جاتی ہے۔ مگر مشہور جرنیل رستم اپنے باپ کا انتقام لیتے ہوئے ملکہ کو اندھا کرکے قتل کر دیتا ہے اور کسی اور کو تخت پر بٹھاتا ہے مگر جلد ہی تخت کیانی پھر لاوارث ہو جاتا ہے، اور بالآخر تلاش بسیار کے بعد کسریٰ کے ایک گمنام پوتے یزدجرد کو کہیں سے لاکر تخت شاہی پر متمکن کر دیا جاتا ہے ـــــ یہی یزدجرد ہے جسے ہم حضرت عمرؓ کی جان نثار افواج کے ساتھ سرزمین فارس اور عراق عجم میں مسلسل برسرپیکار دیکھ رہے ہیں۔ قادسیہ، مدائن اور نہاوند کے میدان اسلام اور جاہلیت کے اس خونین تصادم کی نشانیاں ہیں۔ رستم و ہرمزان جالینوس اور فیروزان اور یزدگرد و خاقان وہی بولہبی شرارے ہیں جو آخر تک چراغ مصطفوی سے ستیزہ کار رہے۔ سعد بن ابی وقاص، ربعی بن عامر، حذیفہ اور مغیرہ رضی اللہ عنہم کے پاک ارواح شہادت دیتے ہیں کہ اسلام کسی لمحہ بھی اس عجمی جاہلیت کا روادار نہیں ہو سکتا۔ قادسیہ کے میدان، فارس کے دشت و صحرا، دجلہ کی طغیانیاں اور مدائن کے کھنڈرات جاہلیت اور اسلام کے درمیان نہ مٹنے والی دوری اور حدفاصل کی گواہی دے رہے ہیں

بہرتقدیر عہد اسلام سے قبل یا اس سے کچھ عرصہ بعد عہد عثمانؓ تک یہ اس شہنشاہیت کی ایک جھلک تھی جسے آج محمد عربیؐ کے غلاموں نے خراج تحسین پیش کیا۔ ان عاشقانِ پاک طینت کے ارواح پر کیا گذری ہوگی جنہوں نے انسان کو انسان کی بندگی سے نکال کر ایک معبود برحق کی چوکھٹ پر لانے کی خاطر اپنی محبوب جان جان آفریں کے سپرد کر دی"۔ اور عجم کے کارگزاروں کو اپنے خون سے لالہ زار بنا دیا۔ عراق اور ایران کے صحراؤں میں اپنے اسلاف کی تگ و تاز اور جہاد پیہم کی ساری داستان ہم بھلا بیٹھے۔

اگر اسلام جشنوں اور یادگاروں کا محل ہوتا اور ہمارا موجودہ عہدِ ذلت و ادبار ان خرمستیوں کو برداشت کرتا اور ہم جشن مناتے بھی تو ہمیں اس فاروق اعظم کا جشن منانا چاہیئے تھا جس کے صدقے آج ہم نہ صرف ایران بلکہ کئی اسلامی سلطنتوں کے دعویدار ہیں۔ صحابہؓ کی جان فروشیاں نہ ہوتیں تو اس دور کی جاہلانہ ملوکیت ہمیں کہاں پہنچائے ہوتی آج ہم عالم انسانیت کیلئے بوجھ ہوتے، انسان انسان کا غلام ہوتا۔ ہمیں یاد منانی ہے تو اپنے جرنیل سعد بن ابی وقاص کی منانی چاہیئے جن کے فولادی عزم و یقین

کے سامنے بحر ظلمات سرنگوں ہوا اور ان صحابہؓ کا جن کے عزم و حوصلہ کے صدقے فارس کے ایوان نغمہ ہائے توحید سے گونج اٹھے۔ یہ عبیدہ اور خالد کی یاد تازہ کیجیئے جن کے عزم و تدبر اور صلابت و ہمت کے سامنے روم کے صنمکدے گھپل کر رہ گئے۔ اسلام کفر اور عہد جاہلیت کے کسی نقش کو تازہ کرنے کا روادار نہیں اور نہ اسلام ایسے لوگوں کی تحسین کرتا ہے خواہ وہ ہمارے آباء و اجداد ہی کیوں نہ ہوں۔ خواہ ایسا ایران میں کیا جائے یا عرب میں افریقہ میں ہوتا ہے یا ہند میں، ہمارے لئے قابل فخر وہی اسلاف ہیں جن کا سب کچھ اول و آخر اسلام کیلئے تھا۔ اگر ہمارے اسلاف میں سے کسی نے خواہ عرب کے ہوں یا عجم کے، اسلام اور داعی اسلام کے بارہ میں اچھی روایت نہیں چھوڑی تو ہم ایسے اسلاف پر فخر و مباہات کی بجائے اظہار نفرت و ملامت کرتے ہیں۔ مسلم کی شان تو یہ ہے کہ: لاتجد قوماً یومنون باللہ والیوم الآخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا آباءھم او ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم

جاہلیت کی یاد خواہ فراعنۂ مصر کی ہو یا ابوجہل و ابولہب قریش کی، مغلوں کے ہلاکو یا چنگیز کی ہو یا یمن کے عاد و ثمود کی، ہندوستان کے راجہ داہر کی یا عراق کے نمرود اور فارس کے دارا و سکندر کی ہر لحاظ سے قابل نفرین ہے۔ اور ہمیں اس دور جاہلیت کو دل و دماغ کے ہر گوشہ سے مٹا دینا چاہئے۔ پھر یہ کیا اندھیر ہے کہ مصر کی فرعونیت اور سندھ کی دہریت پر تو واویلا کیا جائے مگر ایران کی عجمی جاہلیت کی یاد منانے میں سب ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی سعی کریں ــــ ہم امت مسلمہ ہیں عہد جاہلیت کی کوئی یاد کوئی نشان اور کوئی نقش ہمارے لئے لائق اعتناء نہیں اور اس ہادی برحقؐ کی تعلیم ہے۔ جس کے آنے سے جاہلیت کی کایا پلٹ گئی، ایوان کسریٰ میں زلزلہ آگیا اور اس کے چودہ کنگرے زمین بوس ہو گئے۔ شام کے تمام آتشکدوں کی آگ بجھ گئی، بحیرہ ساوہ کا پانی خشک ہو گیا سماوہ کی ندی سوکھ گئی، بحیرۂ طبریہ کا پانی منقطع ہو گیا اور فارس کے چیف جسٹس نے خواب دیکھا کہ مضبوط و توانا اونٹ اور اونٹوں کے پیچھے عربی گھوڑے دجلہ کو عبور کر کے بلاد عجم میں پھیل گئے ہیں ــــ یہ جاہلیت اب قیامت تک قدموں میں پامال ہوتی رہے گی۔ ھلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہ ــــ ہمارے محبوب قائد حضرت عمرؓ نے اس جاہلیت کو ہمیشہ کیلئے زیر و زبر کرنے کے بعد فرمایا تھا۔ آج مجوسیوں کی سلطنت برباد ہو گئی اور اب وہ اسلام کو کسی طرح ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ لیکن اگر تم بھی راست کرداری پر ثابت قدم نہ رہے تو خدا تم سے بھی حکومت چھین کر دوسرے کے ہاتھ میں دے دیگا ــــ کاش

ایران کے ارباب حکومت ہماری اس دردمندانہ گذارشات پر کچھ توجہ دے سکیں۔

⁂

روس کے آمر مطلق اور سابق وزیر اعظم نکیتا خروشچیف انتقال کر گئے، موت بڑی کس مپرسی کی حالت میں ہسپتال میں آئی نہ کہیں ماتم اور نہ کوئی غمگسار، چند احباب اور خاندان کے افراد ہسپتال میں آکر تابوت سے گذرے اور اظہار افسوس کیا، تدفین بھی ایک گمنام قبرستان میں ہوئی جس میں چند ہی قریبی افراد اور اخباری نمائندوں نے شرکت کی قبر پر نہ کوئی چراغ ہے نہ پھول صرف ایک کتبہ جس پر "نکیتا خروشچیف" لکھا ہے۔

یہ اس شخص کا انجام ہے جو نہ صرف ساری دنیا کو جوتا دکھا کر کوس - لمن الملک - بجایا کرتا تھا۔ بلکہ نشۂ اقتدار میں ڈوب کر خدا کے وجود تک کو چیلنج دے بیٹھتا تھا اور پھر جب روس کا ایک خلائی سیارہ واپس ہوا تو اس نے پوری فرعونیت سے کہا کہ خلابازوں کو کہیں خدا نظر نہ آیا۔ مگر جلد ہی اس کا ذلت آمیز زوال شروع ہوا تو خدا نے اس پر اپنی عظمت ثابت کرادی۔ پھر موت بھی آئی تو کیسی۔ ! ؎

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

اپنے عہد عروج میں پوری نسل انسانی کو بحران میں ڈالنے والا مغرور اور غافل انسان جب جارہا تھا تو دو چار آنکھیں بھی اس پر اشکبار نہ تھیں اُسے اگر زندگی میں قانون مکافات اور دنیا کی بے ثباتی کا احساس نہ ہوا تو اب ہو چکا ہوگا۔ اور خدا کے وجود کا اعتراف بھی جبکہ یہ احساس و اعتراف اس کے کسی کام نہیں آسکتا۔ اب سارے پردے سٹ کر حقائق سامنے آچکے ہوں گے۔ یوم تبلی السرائر فمالہ من قوۃ ولا ناصر۔ ایسے لوگوں کی اس دنیا میں جو حالت ہوتی ہے قرآن نے اس کی خبر دی ہے۔ مرنے کے بعد خروشچیف کے چہرہ نے ان دنیا والوں کو بھی ان سرائر کی غمازی کی۔ لاش دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ان کا چہرہ ایسا سکڑا اور مرجھایا ہوا اور اتنا بے رونق اور کریہ تھا کہ انہیں پہچاننا بھی محال تھا۔ یہ مکافات عمل اور نتائج اخروی کی جھلکی ہے۔ ایمان والے تو یہاں بھی چشم بصیرت سے اپنے رب کو دیکھتے ہیں۔ اور وہاں تو دید و مشاہدہ کا کچھ اور ہی عالم ہوگا۔ مگر وہ جنہیں یہاں اس کے وجود سے انکار ہے وہ وہاں بھی اس کے دید سے محروم رہیں گے۔ من کان فی ھذہٖ اعمٰی فھو فی الاٰخرۃ اعمٰی۔ اور جس کا چہرہ یہاں خاک آلود ہے تو وہاں اس کی وحشت اور دہشت کی کیا حالت ہوگی۔ ؟ قرآن سے سنئے ووجوہ یومئذ علیھا غبرۃ ترھقھا قترۃ۔ کتنے چہرے ہیں،

جو اس دن گرد آلود ہیں۔ اور کفر کی کدورت اور الحاد و غرور کی ظلمت انہیں تیرہ و تاریک کر رہی ہے۔ ووجوہ یومئذ باسرۃ تظن ان یفعل بھا فاقرۃ۔ اور کتنے چہرے اس دن سکڑے ہوئے مرجھائے اور بے رونق ہوں گے۔ جنہیں یقین ہوگا کہ اب عذاب کا جو معاملہ ہونے والا ہے وہ تو ہماری کمر توڑ کے رکھ دے گا۔۔۔ العظمۃ للہ۔ ہٹلر، مسولینی، سٹالین، اور جانس ظلم و تکبر کے پتلے مگر انجام کتنا تماشاگاہ عبرت۔؟ آج خروشیف بھی اسی صف میں شامل ہے جو انھم عن ربھم لمحجوبون کا مصداق ہے۔ پوری دنیا میں آج کوئی نہیں جو خروشیف یعنی خدا کے وجود کو چیلنج دینے والے غافل انسان سے اس کا انجام معلوم کرسکے۔ مگر قرآن اس کی خبر دے رہا ہے۔ یقول یلیتنی قدمت لحیاتی۔ کاش! میں خالی نہ چلا آتا۔ ھلک عنی سلطانیہ۔ آج تو میری قوت و مملکت سب برباد ہو چلی۔ فیومئذ لایعذب عذابہ احد ولایوثق وثاقہ احد۔

✯

عرب جمہوریہ مصر کے نئے دستور کی دفعہ ۲ میں صراحۃً اسلام کو سرکاری مذہب اور شریعت اسلامی کو قانون سازی کا بنیادی مصدر قرار دیا گیا ہے۔ الاسلام دین الدولۃ والشریعۃ الاسلامیۃ مصدر رئیسی للتشریع۔ ادھر مصر کے صدر سادات بھی ایسی اصلاحات پیش کر رہے ہیں جن کا مقصد سائنس کے ساتھ مذہب کی بنیادوں پر مملکت کی نئی تعمیر ہے۔ مصری دستور کی یہ مختصر سی دفعہ ہمارے لئے نہایت خوش آئند اور اسلام کے حق میں عالم عرب کے طرز فکر میں اہم تبدیلی کی غمازی کر رہا ہے۔ ہر چند کہ اصل چیز اسلام کا عملاً نفاذ ہے۔ مگر بعض حالات میں چند الفاظ بھی بھاری قدر و قیمت کے حامل بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مصر اور پورے عالم اسلام کو عملاً اس راہ پر گامزن ہونے کی توفیق دے۔ مسلمانوں کو اگر منزل نجات و فلاح تک پہنچنا ہے۔ تو جلد یا بعد از خرابی بسیار اسی جادہ حق پر گامزن ہونا پڑے گا۔

✯

صدر پاکستان کے اقتصادی مشیر ایم ایم احمد پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ خلاف معمول صدارتی گزٹ شائع نہ ہونے سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ شاید وہ ان دنوں قائم مقام صدر کے فرائض بھی سنبھالے ہوئے تھے۔ ملزم متشرع پابند صوم و صلوٰۃ اور دینی جذبات و احساسات رکھنے والا بتلایا جاتا ہے اور اس نے اقبال جرم کر لیا ہے۔ اخبار جنگ کی اطلاع کے مطابق ملزم کے بیان کو اس نے انتہائی صیغہ راز میں رکھا جا رہا ہے کہ اس کی اشاعت مفاد عامہ کے خلاف ہے۔ گویا

یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا تعلق مفاد عامہ سے ہے تو لازماً عوام کے لئے دلچسپی کی چیز ہے، مگر معاملہ چونکہ عدالت میں ہے اس لئے ہم احترام عدالت کی بنا پر اپنی رائے ظاہر کرنے کی پوزیشن میں نہیں، اگرچہ قادیانی پریس نے اپنے "صاحبزادہ صاحب" کے بارہ میں غوغا آرائی کر کے اس احترام کو ملحوظ نہیں رکھا۔ حقائق رفتہ رفتہ عوام کے سامنے آہی جائیں گے۔ کاش! پیمانہ کے یوں چھلک جانے سے یاران میکدہ کچھ چونک اٹھیں۔ فهل من مدکر۔

⁂

صدر پاکستان نے آئین کے جس نئے فارمولے کا اعلان کیا ہے۔ اس کی بنا پر مجوزہ آئین عبوری ہوگا۔ قومی اسمبلی کو اس میں ترمیم و اصلاح کے لئے نوے دن کی مہلت دی جائے گی جس کے بعد آئین حتمی حیثیت اختیار کر جائے گا۔ مجوزہ ترمیمات قومی مفاد سے ہم آہنگ نہ ہونے کی صورت میں اسمبلی میں واپس بھیجے جائیں گے۔ ملکی سالمیت اور نظریۂ پاکستان کے منافی کوئی ترمیم قبول نہیں کی جائے گی۔ گو ہمیں اب تک آئین کے مسودہ کا علم نہیں ہو سکا۔ مگر بظاہر آئین کا یہ نیا فارمولا معقول نظر آرہا ہے۔ موجودہ حالات میں یہی صورت موزوں تھی کہ صدر آئین کے بارہ میں نازک ذمہ داریوں کو بانٹ لیں۔ اور اسمبلی کے تمام ارکان کو بھی اس مسؤلیت میں شریک کر دیں جو خدا، رسول اور اس ملک کے کروڑوں مسلمانوں کی طرف سے صدر اور اسمبلی پر اسلامی آئین کے سلسلہ میں عائد ہوتی ہے اس طرح قومی اسمبلی کی حیثیت دستور ساز اسمبلی کی ہوگی۔ صدر محترم نے اس بھاری بوجھ میں اسمبلی کو بھی شریک کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی خلاف ملک و ملت ترمیمات کا دروازہ بند رکھ کر بہت دور اندیشی اور تدبر کا ثبوت دیا۔

⁂

جزائر فلپائن میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس وقت عیسائیت کے ہاتھوں ظلم و ستم کی چکی میں پس رہی ہے۔ فلپائن میں اسلام اور مسلمانوں کی پوزیشن اور زبوں حالی پر الحق کے پچھلے شمارہ میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہمیں تعجب ہے کہ اس مہذب دور میں حکومت فلپائن ان مظالم کو روکنے کی بجائے عیسائیوں کی پشت پناہی کر رہی ہے اور قتل و قتال کا سلسلہ زوروں پر ہے۔ مسلمانوں کی پوری برادری ایک کنبہ ہے۔ اقصائے مشرق میں رہنے والے مسلمان بھائیوں پر اگر ظلم ہوتا ہے۔ تو پورے عالم اسلام، اسلامی حکومتوں اور تنظیموں کو بے چین ہو کر اس کے خلاف اٹھنا چاہئے مگر ہماری غیرت ملی سرد ہو چکی ہے ورنہ آج صلاح الدین ایوبی اور محمود غزنوی کے مارے ہوئے

عیسائیوں اور ہندوؤں کو یہ ہمت نہ ہوتی۔ ہمیں معلوم نہیں عالم عرب کی عرب لیگ اور اسلامی دنیا کا اسلامی سکرٹریٹ رابطہ عالم اسلامی اور مؤتمر اس وقت کیا کر رہے ہیں۔ اور یہ لمبی چوڑی اسلامی سلطنتیں آخر کس مرض کی دوا ہیں۔! اور کیا اسلامی برادری کے یہ طویل المیعاد جشن ایسے لاکھوں مظلوم بھائیوں کے زندہ درگور ہونے کی خوشی میں منائے جا رہے ہیں۔؟

ایک اطلاع کے مطابق بھارت کے قادیانیوں نے نام نہاد بنگلہ دیش کے لئے بھارت کی تمام پالیسیوں کی مکمل حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔ مشرقی پنجاب کے ضلع گورداسپور میں "قادیان" کے مقام پر احمدیہ فرقہ کے ایک اجلاس میں بنگلہ دیش کیلئے بھارت کی پالیسی کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے مالی امداد دینے کا بھی اعلان کیا گیا۔ اور بھارتی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ بنگلہ دیش تسلیم کرے اجلاس نے اپنے فرقہ کے تمام افراد کو ہدایت کی کہ وہ بنگلہ دیش کی تحریک میں ہر ممکن تعاون کریں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس تعاون کی اپیل صرف بھارتی قادیانیوں سے کی گئی ہے یا دنیا بھر کے تمام قادیانیوں سے مگر "قادیان" جیسے مرکز کی تقدیس" دنیا بھر کے قادیانیوں کیلئے نظر انداز کرنی مشکل ہے۔ ہم اس خبر پر اپنی طرف سے کیا حاشیہ آرائی کر سکتے ہیں۔ ع آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا اور اس کے ساتھ سعودی عرب کے مؤقر جریدہ البلاد ۱۶ ستمبر کی یہ اطلاع بھی پڑھئے جو ایڈیٹر نے پر جوش ایمانی جذبہ میں ڈوب کر اپنے اداریہ میں دی ہے کہ محمود قاسم نامی مجیب الرحمان کے کسی نام نہاد ساتھی نے اسرائیل کا دورہ کیا۔ اسرائیل نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور باقاعدہ وفد کے ساتھ دوبارہ اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ پورے جوش و خروش سے بنگلہ دیش کے موقف کو سراہا اور بیت المقدس میں اس کے لئے پریس کانفرنس کا انتظام کرایا گیا ـــــ اسرائیل ـــ بھارت ـــ اور اس کے ساتھ قادیانیت؟ کیا ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں تو نہیں ہیں۔ قادیانیت اسرائیل کو اپنا سرپرست بھی سمجھ رہی ہے قادیانیت بنگلہ دیش کے لئے امداد کی اپیل بھی کر رہی ہے۔ اور قادیانیت پاکستان کی سلامتی اور تحفظ کی واحد علمبردار بھی بنی ہوئی ہے۔ یا للعجب۔ کیا تاریخ میں مسلمانوں کے خلاف ایسی دھاندلی کی کوئی اور مثال بھی مل سکتی ہے۔؟

اخبار جنگ کا ایک مراسلہ نگار مقیم امریکہ ۱۳ ستمبر کے پرچہ میں اپنے مشاہدات امریکہ لکھتے ہوئے رقمطراز ہے: "آجکل امریکہ میں خبائث حاضرات اور علوم روحانیہ سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

نئی پود افیون، گانجے کی نشہ آور مجذوبیت سے لیکر مردوں کی روحوں سے بات چیت کرنے اور علم نجوم سے حالاتِ زندگی تلاش کرنے کی طرف بہت مائل ہے۔ زیادہ ذہین اور متلاشی نوجوان مذاہب مختلفہ پر کتابیں پڑھتے اور تقریریں سنتے ہیں۔ اور ہر ائتی علامہ اور سوامی کے در پہ پہنچتے ہیں کہ جہاں سے انہیں دلی اور روحانی تسلی ہو سکے۔ آجکل "YOGA" کا یہاں کافی تذکرہ ہے مگر سب سے زیادہ تسلط جادو ٹوٹکے کا ہے، ٹونے ٹوٹکے کا کاروبار زوروں پر ہے علوم رموز کے ہتھکنڈوں سے روپیہ بٹورنے والے کافی ہیں۔ کم وبیش دس گیارہ ماہنامے علوم مخفیہ پر یہاں چھپتے اور لاکھوں کی تعداد میں بکتے ہیں۔ ہر اخبار میں روزانہ نجوم کا کالم ہوتا ہے"

اس سے اندازہ لگائیے اس مہیب روحانی خلا کا جس سے آج کا یورپ دوچار ہے۔ سائنس فلسفہ اور ٹکنالوجی کا عہد عروج، روشن خیالی کے دعوے مگر چاند پر کمند ڈالنے والا انسان جتنا بلندی پر جاتا ہے اتنا ہی تخیلات اور طلسمات کی کھائیوں میں گرتا جارہا ہے۔ رمل وجفر، کہانت، جوگ اور یوگ القاءِ شیطان اور مرتاض جوگیوں کے گورکھ دھندوں سے جس مذہب نے انسان کو نکالا تھا اسے نظر انداز کرکے یورپ آج اپنی فطری طلب وتجسس کی پیاس کہاں کہاں بجھانا چاہتا ہے مگر فطرت کی تشنگی جس آبِ زلال سے ہو سکتی ہے اسے تو ہاتھ نہیں بڑھایا جاتا۔ نتیجۃً بے چینی اور اضطراب بڑھ رہا ہے۔ اب اسے کون سمجھائے کہ سکون اور مسرت ان اوہام وخرافات میں نہیں نہ اسرار ورموز پر مبنی مخفی علوم میں یورپ کا مشینی انسان یہ دولت اگر پاسکتا ہے تو صرف اس آسمانی دین سے جو نہ عقل سے متصادم ہے نہ سائنس سے اس میں ظن وتشکیک کی کوئی تاریکی نہیں نہ جادو ٹوٹکے کی توہم پرستی، جسکا ظاہر اور باطن ایک ہے، دن اور رات برابر لیلہا کنہارہا ۔۔۔ مغرب کے مجبور وبے کس انسانو! اگر تمہیں سکونِ خاطر کی تلاش ہے، تو آؤ! محمد عربی صلوات اللہ علیہ کے مطب سے تمہاری تشنہ تپتی روح کو سکون اور آسودگی کا سارا سامان مل سکے گا۔ اور اسلام کے شجرۂ طوبیٰ کے سائے میں راحت قلب ونظر بھی۔

⁂

حجاز کے مشہور علم دوست بزرگ شیخ محمد نصیف ۸ رجمادی الثانی کو جدہ میں واصل بحق ہوئے، خود بھی عالم تھے، زندگی علم کی اشاعت اور اہل علم کی قدردانی میں بسر ہوئی۔ متمول شخص تھے مگر سارے وسائل کو علم اور نوادرات علم کے فروغ واشاعت کا ذریعہ بنایا ۔۔۔ کچھ عرصہ قبل شیخ مکہ علامہ علوی مالکی کا بھی انتقال ہوا آپ مکہ مکرمہ کی علمی زندگی کی رونق تھے۔ حرم شریف میں ان کا درس دورِ سلف کی یاد دلاتا۔ حجاز کی سرزمین میں ایسے بزرگوں کا وجود عنقا بنتا جارہا ہے حق تعالیٰ مرحومین کو مقامات قرب سے نوازے۔ آمین۔

واللہ یقول الحق وھو یہدی السبیل۔

سمیع الحق
۸ر شعبان ۱۳۹۱ھ

مگر مغربی علوم اور تعلیمات جدیدہ ان معانی سے عموماً خالی ہیں وہ خدا کے وجود اس کی غیر متناہی طاقتوں اور عالم آخرت کی جزا اور سزا۔ اس کی صفات کاملہ سے (جو کہ کمل امن وامان کے ذرائع اور حقیقی ترقی انسانی اور روحانیت کاملہ کے وسائل تھے) نہ صرف بے پرواہ ہیں۔ بلکہ لبسا اوقات ایسی تعلیم پر استہزا کرنے والی اور الحاد و دہریت (جو کہ تمام مفاسد کی جڑ ہے۔) کی طرف کھینچ کر لے جانے والی ہیں۔ وہ روحانیت اور ملکیت کی دشمن اور مادہ پرستی کی شیدا ہے۔ وہ اسباب مزعومہ اور علل مخترعہ کی اس قدر فریفتہ ہے کہ اس کے نیازمندوں کو کبھی روح اور ما فوق الطبیعۃ کا وہم و خیال بھی نہیں آتا۔ روحانی ترقیات اور ملکی صفات و احوال سے اسکو انتہائی گریز ہوتا ہے۔ وہ خود غرضی کے میدان میں اس قدر سرگرم ہے کہ جس کے لئے اقوام اور امم کو ممالک و اقالیم کو موت کے گھاٹ اتار دینا اور بے زر و بے درم بنا دینا نہ صرف جائز بلکہ کمال شمار کرتی ہے۔ چنانچہ یہی معاملہ تمام یورپین اقوام کا اپنی مستعمرات کے ساتھ جاری ہے۔

سر جان سٹور ۱۸۲۳ء میں کہتا ہے: برطانوی صنعت بڑھانے کے لئے ہندوستانی دستکاری کا گلا گھونٹنا بڑے فخر کے ساتھ انگریزی تدبر قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ برطانوی فسادات کا ایک بہت ہی بڑا ثبوت ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اپنے ملک کی ترقی کے لئے انگریزوں نے کس طرح چونگی اور محصول لگا کر ہندوستانی صنعتی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

دوسری جگہ لکھتا ہے: لیکن ہندوستان کا عہد زریں گذر چکا ہے۔ جو دولت کبھی اس کے پاس تھی اس کا جزو اعظم ملک کے باہر کھینچ کر بھیج دیا گیا ہے۔ اور اس کے قدرتی عمل اس بد عملی کے ناپاک انتظام نے معطل کر دئے ہیں۔ جس نے لاکھوں نفوس کی منفعت کو چند افراد کی خاطر قربان کر دیا ہے۔

(حکومت خود اختیاری)

وہ نفاق اور ڈپلومیسی کو پایۂ فضیلت اور ذریعۂ فخر و مباہات سمجھتی ہے۔ سر جارج الین

اینڈ الوین لندن کا مشہور پبلشر کتاب جنس تمدن سے اقتباس ذیل شائع کرتا ہے۔ موجودہ تمدن کا سارا لب لباب منافقت ہے۔ لوگ اپنا عقیدہ ظاہر خدا پر کرتے ہیں۔ لیکن عملاً اپنی جانیں تک مال پر قربان کرتے رہتے ہیں۔ زبانوں پر آزادی کا دعویٰ رہتا ہے۔ لیکن جو آزادی کے علمبردار ہوتے ہیں۔ ان کو ہی سزا ملتی ہے۔ دعویٰ مسیح کی پیروی کا ہے۔ اور اطاعت مسولینی کی کی جارہی ہے۔ عزت کے الفاظ عصمت کے متعلق استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن عملی زندگیاں حرامکاری اور آتشک کیلئے وقف ہیں۔ زبانی داد سچائی کی دیتے ہیں۔ لیکن عملاً اقتدار و اختیار کی کرسیوں پر بد دیانتوں ہی کو بٹھائے ہوئے ہیں۔ زبانوں پر اخوت کے نعرے ہیں۔ لیکن جو بھائی ان کی جنگ یا وطنیت یا قومیت کے بدمستانہ جلوسوں میں شریک نہیں ہوتے ان کے لئے یا جیل خانہ ہے، یا جلاوطنی، یا بندوق کی گولیاں۔
(سچ لکھنؤ ۲۴ر جنوری ۱۹۳۰ء)

وہ حدود و قوانین کی مراعات کرتے ہوئے ہر قسم کی بے حیائی فواحش، اسراف کو جائز رکھتی ہیں۔ وہ فضول خرچی کی نہ صرف اجازت دیتی ہیں۔ بلکہ لبسا اوقات ضروری قرار دیتی ہے۔ انگلستان اور دیگر ممالک یورپ اور امریکہ کے غیر صحیح النسل بچوں کی تعداد ہائیڈ پارک اور دوسرے مقامات کی حرامکاری کی رپورٹیں اور اعداد و شمار، مادر زاد برہنگی کی روزافزوں ترقی وغیرہ طلاق اور خلع کا موجیں مارنے والا سیلاب دیکھئے اور غور کیجئے۔ وہ اپنے وطن اور قوم کے لئے ہر قسم کے مظالم ہر قسم کی دست درازیاں روا اور جائز سمجھتی ہیں۔

سرجان شور ۱۸۳۳ء میں کہتا ہے: "برطانیہ نے جو طرز حکومت قائم کیا ہے۔ اس کے تحت میں ملک اور باشندگانِ ملک رفتہ رفتہ محتاج ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان پرانے تاجروں پر جلد تباہی آگئی۔ انگریزی حکومت کی بیس ڈالنے والی زیادہ ستانی نے ملک اور اہل ملک کو اتنا مفلس کر دیا ہے کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

جان سلیون کہتا ہے۔ ہمارا طرز حکومت اسفنج کی مانند گنگا کے دھارے سے ہندوستان کی دولت چوستا ہے۔ اور دریائے ٹائمس کے کنارے جاکر نچوڑ دیتا ہے۔ (حکومت خود اختیاری)

وہ مذہب اور دین کو جنون اور لغو قرار دیتے ہوئے لامذہبی کو مایۂ افتخار و مباہات سمجھتی ہے۔ وہ اس دنیوی زندگی اور مادی ترقی ہی کو مقصدِ حیات اور بام ترقی قرار دیتی ہے۔ اس کے بعد اس کے نزدیک کوئی مقصد اور مطمح نظر نہیں ہے۔ وہ انبیاء اور اس کی تعلیمات زاکیہ کو بے معنی اور دشمن انسانیت سمجھتی ہے۔ وہ رشتہ داروں میں میل ملاپ، بڑوں اور بزرگوں سے تادیب، چھوٹوں اور اپنوں پر رحمت

شفقت فقیروں اور مسکینوں کی خبر گیری اور ان پر خیرات وصدقات کی دشمنی ہے۔ وسادہ زندگانی اور کم خرچ معیشت ——— کی راہ میں انتہائی رکاوٹ پیدا کرنے والی اور سرمایہ دار مادہ پرست مغربی قوموں کے فیشن کا پرستار بنانے والی ہے۔ خیال فرمائیے کہ وہ امریکہ جس کے ہر فرد کی روزانہ آمدنی کا اوسط چودہ روپیہ ہے۔ اور وہ انگلستان جس کے ہر فرد کی اوسط روزانہ چھ روپے بارہ آنے ہے۔ (دیکھئے انقلاب مورخہ ۲۹ر جولائی ۱۹۲۸ء)

اس کے فیشن اور تہذیب ومصارف کا اتباع اگر برطانی عہد کا وہ ہندوستان کرنے لگے جس کے ہر فرد کی روزانہ آمدنی کا اوسط ایک پنس بقول مسٹر ولیم ڈگبی اور ڈیڑھ آنہ بقول انقلاب ۲۹ر جولائی ۱۹۲۸ء اور تقریباً سوا آنہ بقول لارڈ کرزن پڑتا ہے۔ تو بجز ہلاکت اور بربادی کیا حاصل ہوگا۔ یہی اور ان کے مثل دیگر وجوہ ہیں۔ جنہوں نے عالم مشرق اور بالخصوص اسلامی دنیا اور بالاخص مسلمانان ہند کے علوم ومعارف اور ان کی درسگاہوں اور ان کی زندگانی کو تباہی کے گھاٹ میں اتار دیا۔ مغرب کے سربرآوردوں نے ہمیشہ سے مشرق کی تعلیم گاہوں اور علوم کو مٹانے میں انتہائی سرگرمی کا ثبوت دیا۔ وہ قرآن شریف جو کہ تمام علوم ومعارف کا سرچشمہ ہے۔ اور تمام کمالات دینی ودنیوی۔ روحانی اور مادی کا مرکز ومنبع ہے۔ جس وقت سے وہ اتارا گیا ہے آج تک محفوظ ومصوّن رہ کر ہر قسم کی تحریفات وغیرہ سے پاک اور صاف ہے۔ جس کے ہر قسم کے کمالات کا نہ صرف مسلمان بلکہ مخالفین بھی پرزور الفاظ میں اقرار کرتے رہے ہیں۔

سرولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمد میں لکھتا ہے: جہاں تک ہماری معلومات ہیں، دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو اس (قرآن مجید) کی طرح بارہا صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو۔

ڈاکٹر موریس فرانسیسی مشہور مصنف لکھتا ہے: قرآن دینی تعلیم کی خوبیوں کے لحاظ سے تمام دنیا کی مذہبی کتابوں سے افضل ہے۔ بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قدرت کی ازلیہ عنایت نے جو کتابیں دیں ان سب میں قرآن بہترین کتاب ہے۔ ڈاکٹر موریس کہتا ہے: قرآن نے دنیا پر وہ اثر ڈالا جس سے بہتر ممکن نہ تھا۔ (تنقید الکلام مصنفہ سید امیر علی)

ڈاکٹر اسٹین گاس اپنی ڈکشنری میں لکھتا ہے۔ قرآن کی خاص خوبی اس کی ہمہ گیر صداقت میں مضمر ہے۔ جارج سیل (مشہور مترجم قرآن) کہتا ہے۔ قرآن جیسی معجز کتاب انسانی قلم نہیں لکھ سکتا۔ یہ مستقل معجزہ ہے۔ جو مُردوں کو زندہ کرنے کے معجزہ سے بلند تر ہے۔ پادری وال ریسن بی ڈی (پیٹسبرگ کے گرجہ میں امن عالم کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے) کہتا ہے: مسلمانوں کا مذہب جو قرآن کا مذہب ہے، ایک امن اور

سلامتی کا مذہب ہے۔

گاڈفری ہگینس کہتا ہے: قرآن کمزوروں اور غریبوں کا غمخوار ہے۔ اور ناانصافی کی جابجا مذمت کرتا ہے۔ ڈاکٹر کینن آئزک ٹیلر (کلیسائی انگلستان کے صدر نشین کی حیثیت سے ۱۸۸۷ء میں تقریر کرتے ہوئے) کہتا ہے: اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے جو تہذیب و تمدن کا علمبردار ہے۔

نیر الیسٹ (لندن کا مشہور اخبار) لکھتا ہے: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ارشاد (قرآن) کی قدرو قیمت اور عظمت و فضیلت کو اگر ہم تسلیم نہ کریں تو ہم فی الحقیقت عقل و دانش سے بیگانہ ہیں۔

مسٹر جان ڈیون پورٹ اپنی کتاب اپالوجی فار محمد اینڈ دی قرآن میں لکھتا ہے: منجملہ بہت سی اعلیٰ درجہ کی خوبیوں کے جو قرآن کے لئے واجب طور پر باعث فخر و ناز ہو سکتی ہیں۔ دو خوبیاں نہایت بیّن ہیں۔ یعنی اوّل تو اس کا مؤدبانہ اور ہیبت و رعب سے بھرا ہوا طرزِ بیان جو ہر اس مقام پر جہاں خدا تعالیٰ کا ذکر یا اس کی ذات کی طرف اشارہ کرتی ہے اختیار کیا گیا ہے۔ اور جس میں خداوند عالم کی ذات سے ان جذبات اور اخلاقی نقائص کو منسوب نہیں کیا گیا۔ جو انسان میں پائے جاتے ہیں۔ دوسرے اس کا ان تمام خیالات و الفاظ اور قصوں سے مبرا ہونا جو فحش اور خلاف اخلاق اور غیر مہذب ہوں۔ حالانکہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ یہ عیب، توریت وغیرہ کتب مقدسہ یہود میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ فی الحقیقت قرآن ان سخت عیوب سے ایسا مبرا ہے کہ اس میں خفیف سے خفیف ترمیم کی بھی ضرورت نہیں۔ اوّل سے آخر تک اسے پڑھ جائیے تو اس میں کوئی بھی ایسا لفظ نہ پائیے گا جو پڑھنے والے کے چہرہ پر شرم و حیا کے آثار پیدا کرے۔ قرآن میں ذات باری کی تعریف نہایت مشرح اور صاف ہے۔ اور جو مذہب اس نے ان خوبیوں کے ساتھ قائم کیا ہے وہ وحدانیت الٰہی کا نہایت پختہ اور شدید یقین ہے۔ اور بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کو فلسفیانہ طور پر صرف ایسا مسبب الاسباب مان لیا جاتا ہے جو اس عالم کو اپنے مقررہ قوانین پر چلا کر خود اپنی شان و عظمت کے ساتھ الگ ہے۔ کہ اس تک کوئی شئے نہیں پہنچ سکتی۔ قرآن کی رو سے ہر وقت حاضر و ناظر ہے۔ اور اس کی قدرت کاملہ ہمیشہ اس عالم میں عامل اور متصرف ہے۔ علاوہ ازیں اسلام ایسا مذہب ہے جس کے اصول میں کوئی امر متنازعہ فیہ نہیں اور چونکہ اس میں کوئی ایسا معمہ نہیں جو سمجھ میں نہ آسکے اور زبردستی قبول کرنا پڑے اس لئے وہ لوگوں کے خیالات کو ایک سیدھی سادھی اور ایسی پرستش پر قائم رکھتا ہے جو تغیر پذیر نہیں ہے۔ حالانکہ تیز اور تند اور اندھا دھند جوش مذہبی نے پیروان اسلام کو اکثر اوقات آپے سے باہر کر دیا ہے۔

سب سے آخری بات یہ ہے کہ اسلام ایسا مذہب ہے کہ جس سے ولیوں، شہیدوں، تبرکات

اور تصویروں کی پرستش اور ناقابل فہم باتیں اور حکیمانہ باریکیاں اور راہبوں کی تجرید اور تعذیب نفس بالکل خارج کر دی گئیں ہیں، چنانچہ اسلام میں ایسے ثبوت موجود ہیں کہ جن پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بانی نے ماہئیت اشیاء اور اس زمانہ کی قوتوں کی حالت اور اس امر پر کہ مسائل مذہبی سے کیونکر مطابق ہو سکتی ہے۔ ایک طویل اور عمیق غور کے بعد اپنے مذہب کی بنا ڈالی ہے۔ اور اس وجہ سے کچھ محل تعجب نہیں ہے کہ اسلامی طور کی پرستش اہل کعبہ کی بت پرستی اور صائبین کی پرستش اجرام فلکی اور زردشتیوں کی آتش پرستی پر غالب آگئی۔ (معجزۂ قرآن مجید صفحہ ۱۶۳)

چیمبرز انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار مذہب اسلام کے متعلق لکھتا ہے کہ: مذہب اسلام کا وہ حصہ جس میں بہت کم تغیر و تبدل ہوا ہے (بلکہ نہیں ہوا مقرر) اور جس سے اس کے بانی کی طبیعت صاف صاف معلوم ہوتی ہے۔ اس مذہب کا نہایت کامل اور روشن حصہ ہے۔ اس سے ہماری مراد قرآن کے علم اخلاق سے ہے۔ ناانصافی، کذب، غرور، انتقام، غیبت، استہزاء، طمع، فضول خرچی، عیاشی، خیانت اور بدگمانی نہایت قابل ملامت قرار دی گئی ہیں۔ اور ان کو قبیح اور بے دینی بتایا ہے۔ بمقابلہ ان کے خیراندیشی، فیض رسانی، پاک دامنی، حیا، تحمل، صبر، کفایت شعاری، سچائی، راست بازی، عالی ہمتی، صلح پسندی اور سچی محبت اور سب سے بڑھ کر توکل بخدا اور انقیاد امر الٰہی کو حقیقی ایمانداری کی اصل بنیاد اور مومن صادق کا اصل نشان قرار دیا ہے۔ (معجزۂ قرآن مجید صفحہ ۱۶۵)

اسی مکمل کتاب اور بے نظیر کلام الٰہی کے متعلق مشہور ذمہ دار برطانیہ مسٹر گلیڈ اسٹون بھرے مجمع میں اس کو اٹھاتے ہوئے بلند آواز سے کہتا ہے: جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہو سکتی۔ انہیں علوم اور مدارس کے مٹانے اور مہلک علوم جدیدہ کو شائع کرنے کیلئے لارڈ میکالے کہتا ہے: ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو اگر رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں تو دل و دماغ کے اعتبار سے فرنگی۔ (مدینہ بجنور ۲۰ر جنوری ۱۹۳۶ء)

باوجودیکہ ہندوستان میں برطانوی حکومت سے پہلے ہر قریہ اور دیہات میں مشرقی علوم کے مدارس موجود تھے۔ جیسا کہ سر ٹامس منرو کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہندوستانیوں کا طریقہ کاشتکاری بے مثل صنعت و حرفت، ان کی صنعت و کاشتکاری کے معاملہ میں اعلیٰ استعداد ہر قریہ میں ایسے مدارس کی موجودگی جس میں نوشت و خواند اور حساب کی تعلیم ہوتی ہے۔ ہر شخص میں مہمان نوازی اور خیرات کرنے کا مبارک جذبہ موجود ہو۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ صنف نازک پر پورا اعتماد کیا جاتا ہو اسکی عزت و عصمت اور عفت کا پوری طرح کا لحاظ رکھا جاتا ہو۔ یہ ایسے اوصاف ہیں کہ جن کے ہوتے

ہوئے ہم اس قوم کو غیر مہذب اور غیر متمدن نہیں کہہ سکتے۔ ایسی صفات کی موجودگی میں ہندوستان کو یورپی اقوام سے کسی طرح کمتر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر انگلستان اور ہندوستان کے درمیان تہذیب تمدن کی تجارت کی جائے۔ تو مجھے یقین کامل ہے کہ ہندوستان سے تمدن کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہوگی۔ اس سے انگریزوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ (دیکھئے حکومت خود اختیاری)

مگر برطانوی حکومت نے ان مدارس کو اپنی ناپاک اور نجس پالیسی کی بنا پہ تباہ و برباد کر دیا۔ مسٹر لڈلو اپنی تاریخ برطانوی ہند میں لکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوؤں کے ہر گاؤں میں جو اپنی قدیم شان اور حیثیت کو قائم رکھے ہوئے تھا عام طور پر بچے لکھ پڑھ سکتے تھے اور حساب میں انہیں خاص مہارت ہوتی تھی۔ لیکن ہم نے بنگال کی طرح جہاں جہاں دیسی سسٹم کو فنا کر دیا ہے اس جگہ دیسی مدرسے بھی فنا ہو گئے (حکومت خود اختیاری)

جبکہ ہندوؤں کے ہر گاؤں میں بچے عام طور پر لکھے پڑھے ہوتے تھے اور مدارس قائم تھے تو مسلمانوں کے گاؤں میں اور ان کی اولادیں کہیں زیادہ تعلیم گاہیں اور علم و ہنر ہوگا۔ کیونکہ مسلمانوں کا مذہب تعلیم و تعلم کو فرض قرار دیتا ہے۔ وہ اس وقت تمام سیاست اور نظام کے مالک تھے۔ آنریبل مسٹر ایلفنسٹن اور الیف وارڈن نے ۱۸۲۳ء اور ۱۸۲۵ء میں مسئلہ تعلیم پر ایک یادداشت مرتب کی تھی جس میں انہوں نے اس نقصان کو تسلیم کیا جو ملک کو انگریزوں کی ذات سے پہنچا تھا۔ ان کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

ہم نے ہندوستانیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دئیے۔ اور ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ تعلیمی ترغیب نہیں ہوتی بلکہ اس سے قوم کا علم سلب ہوا جاتا ہے۔ اور علم کے پچھلے ذخیرے نسیا منسیا ہوئے جاتے ہیں اس الزام کے رفع کرنے کیلئے کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے۔۔۔ (حکومت خود اختیاری)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ انیسویں صدی کے ابتدائی ہی حصہ میں برطانوی مدبرین نے مدارس اور تعلیم گاہوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اور ملک ہند سے علمی ذخائر کو معدوم کر کے ہندوستانیوں کو کاہل بنا دیا تھا۔ برطانوی ناپاک پالیسی کا ہمیشہ سے تقاضا یہی رہا ہے کہ وہ ہندوستانیوں کے کسی قسم کے علم کو بھی رائج نہ ہونے دیں۔ سر ولیم ڈگبی اپنی کتاب پراسپرس برٹش انڈیا میں میجر جنرل اسمتھ کے۔ سی۔ بی۔ کی شہادت قلم بند کرتے ہوئے لکھتا ہے:

سوال:۔ کیا آپ کسی طرح اس بات کی روک کر سکتے ہیں۔ کہ دیسیوں کو ان کی طاقت کا علم نہ ہو۔
جواب:۔ میرے خیال میں انسانی تاریخ میں کوئی ایسی تاریخ نہیں ملتی کہ معدودے چند اغیار چھ کروڑ

مولانا لطافت الرحمان صاحب استاذ العلوم الشرعیۃ والادب العربی
جامعہ اسلامیہ بہاولپور

پیش لفظ اس مضمون میں عنوان بالا کے دونوں حصوں پر جو کچھ عرض کرنا ہے۔ اس میں ایک تو نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ مضمون کو عام فہم بنانے کیلئے ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس سلسلہ کی بعض علمی اور ضروری باتوں کو بھی مضمون میں نظرانداز کیا گیا ہے۔ نیز چونکہ مضمون کا زیادہ تر مواد کچھ درسی محفوظات اور مخطوطات سے وابستہ ہے۔ اس لئے تمام حوالجات کی تکمیل نہ ہو سکی تاہم نقول قابلِ وثوق ہیں۔ واللہ المستعان وعلیہ التقۃ والتکلان۔

لفظ حدیث کا لغوی معنی لفظ حدیث پر سیر حاصل بحث نہ تو اپنے بس کی بات ہے اور نہ ہی اس مختصر مضمون میں اس کا پورا بیان ہو سکتا ہے۔ البتہ مختصراً عرض ہے کہ لفظِ حدیث ہیں عام طور پر قدیم شراحِ حدیث کا خیال ہے کہ لغوی معنی کے لحاظ سے یہ لفظ "حدوث" سے لیا گیا ہے۔ جو قدم کی ضد اور مقابل ہے گویا وحی متلو جو کلام اللہ ہے وہ قدیم ہے۔ اور وحی غیر متلو جو کلام الرسول ہے۔ وہ حادث ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ عسقلانی جلال الدین سیوطی اور دیگر شارحینِ حدیث نے اس لفظ میں حدوث و قدم کا تقابل زیرِ نظر رکھا ہے۔ لیکن مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے اس پر جو محدثانہ تحقیق فرمائی ہے۔ وہ معمولی تغیر و اضافہ کے ساتھ حسبِ ذیل ہے:

فرماتے ہیں کہ لفظِ حدیث لغوی معنی کے اعتبار سے "تحدیث بالنعمۃ" سے ماخوذ ہے اور سورۃ الضحیٰ کی آخری آیت کا ایک گونہ اقتباس ہے۔ وہ اسطرح کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں حضور علیہ السلام پر اپنے چند مکارم و عنایات کو شمار کرتے ہوئے فرمایا کہ —— آپ یتیم اور ظاہر بے آسرا تھے، اللہ نے آپ کو ٹھکانہ دیا۔ آپ کے پاس مستقل شریعت نہ تھی، اللہ نے آپ کو

مکمل شرع و منہاج عطا فرمایا۔ آپ مفلس اور تنگدست تھے اللہ نے آپ کو غنی کر دیا۔ آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے درج بالا تین محدود عظیم القدر نعمتوں کے رد عمل میں گذشتہ ترتیب کو بدل کر حضور علیہ السلام کو تین باتوں کا حکم دیا۔

۱۔ یتیم کو غصے نہ ہو، جب کہ تم پر خود یہ حالت گذری ہے۔

۲۔ سائل و مسکین کو نہ ڈانٹ، جب کہ تم خود اس حالت سے دوچار رہے ہو۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی اس عظیم تر نعمت کی تحدیث اور چرچا کرو جو بصورت ملت مستقلہ آپ کو دی گئی جس کے لئے آپ کوشاں اور ساعی و داعی تھے، بلکہ استقلال قبلہ کے بارہ میں تو اللہ نے صاف فرمایا: قد نریٰ تقلب وجهك في السماء۔ اب اس توجیہ کے تحت چونکہ شریعت حقہ محمدیہ علی صاحبہا الوف التحیہ کا تمام تر سلسلہ ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ بنابریں اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے پھیلانے اور رواج دینے کا حکم دیدیا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ حدیث ہی اس نعمت جلیلہ کی نشر و اشاعت، ترویج و تبلیغ کا ذریعہ اور سنگ بنیاد ہے۔ اور بہ الفاظ دیگر آیت کریمہ: وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ کی تکمیل اور تعمیل ہے۔

پھر تحدیث نعمت کی یہ مہم جن وسیع اور مستحکم بنیادوں پر استوار ہو کر چلائی گئی ہے، اور ظاہری ذرائع و وسائل کے فقدان یا قلت کے باوجود اس نعمت کا جو چرچا ہوا ہے، ہو رہا ہے، ہوتا رہے گا۔ یہ سب باتیں انسانی سعی و کوشش کی سطح سے بالا تر ہیں اور حقیقۃً اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے۔ ورفعنا لك ذكرك۔ کی عملی تشریح ہے۔

ابتداء اسلام میں خود پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والسلام اور ان کے جان نثار صحابہ کرام نے اس دین قیم کے پھیلانے میں جو کارنامے انجام دئیے ہیں۔ نیز زمانہ مابعد میں اس نعمت جلیلہ کا بحر ذخار جس وسیع اور ہمہ گیر پیمانہ پر اطراف عالم میں پھیلتا چلا گیا ہے۔ وہ سب باتیں واضح ہیں۔ غرض یہ کہ امت مسلمہ کے اسلاف اور اخلاف میں حدیث نبوی کی روایت بھی جاری رہی اور درایت بھی، درس و تدریس کا کام بھی ہوتا رہا اور قضاء و فتویٰ کا بھی۔ تصنیف و تالیف بھی ہوتی رہی اور حفظ و نگہداشت بھی۔ اور اگر عہد رسالت میں حضرات صحابہ، اصحاب صفہ نے آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کو یاد کرنے اور مشکوٰۃ نبوت سے صحیح طور پر سمجھنے کیلئے مدرسہ و مکتب کی بنیاد قائم کی تھی تو یہ سلسلہ بھی بحمد اللہ قیام قیامت تک جاری ہے۔ ع ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔

تاریخ اسلام کے قرون مشہود لہا بالخیر اور ماضی بعید کے زریں ادوار سے قطع نظر کر کے

ماضی قریب ہی کو لے لیا جائے جب کہ مذہب اسلام کو ہندوستان میں بھی سیاسی عروج حاصل ہوا اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ یہاں حدیث رسول پہنچ کر رواج پذیر ہوتی چلی گئی اور رفتہ رفتہ نوبت بہ ایں جا رسید کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور ان کے رفقاء کار اکابر نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا، جو شرع محمدی اور حدیث نبوی کے پھیلانے کا ایک زبردست عالمی مرکز ہے اور اس وقت تمام ممالک اسلامیہ کے علاوہ خود ہندوستان و پاکستان میں اس کی ذیلی شاخیں اور علمی مراکز کارفرما ہیں، جو ترویج دین اور موضوع مضمون تحدیث نعمت کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں جن میں سے مغربی پاکستان کے چیدہ چیدہ اور بلند علمی مدارس حسب ذیل ہیں :

دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ، مدرسہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی ، دارالعلوم کراچی ، دارالعلوم کھڈہ کراچی ، دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈوالہ یار سندھ - خیر المدارس ملتان ، قاسم العلوم ملتان ، جامعہ اشرفیہ لاہور، جامعہ مدنیہ لاہور - مدرسہ تعلیم القرآن راولپنڈی ، دارالعلوم سرحد پشاور جامعہ اشرفیہ پشاور - دارالعلوم اسلامیہ سیدو شریف سوات - وغیرہ وغیرہ — کثر اللہ عددھا وعددھا . واطال مددھا ومددھا اللھم آمین -

لفظ حدیث کا اصطلاحی معنی | حدیث کے اصطلاحی معنی یعنی فنی تعریف و تحدید میں اس حد تک تو اتفاق ہے کہ ، الحدیث اقوال النبی صلی اللہ علیہ وسلم وافعالہ واحوالہ - افعال میں تقریر اور بعض قسم کے وہ تروک بھی داخل ہیں جن کی تفصیل امام شاطبیؒ سے منقول ہے . البتہ احوال کے معنی مراد میں علماء حدیث اور علماء اصول فقہ کی دو مختلف اصطلاحیں ہیں . چونکہ علم اصول فقہ کی تعریف ہی "العلم بالاحکام الشرعیۃ العملیۃ عن ادلتھا التفصیلیۃ" ہے اور حکم کا معنی یہاں پر خطاب اللہ المتعلق بافعال المکلفین اقتضاءً او تخییرًا او وضعًا " ہے . اس بنا پر علماء اصول فقہ کا مطمح نظر انسان کے اختیاری اور ارادی افعال ہیں جس کے لحاظ سے حضور علیہ السلام کے غیر اختیاری حالات اور کوائف مثلاً ولادت ، رضاعت ، طفولیت ، حلیہ و شمائل ، شکل و شباہت ، مرض ، وفات کے احوال و کیفیات اُن کی اصطلاح کی رو سے حدیث کی تعریف سے خارج ہیں . اس کے برخلاف علماء فن حدیث کے یہاں چونکہ احوال میں اختیار و ارادہ کی کوئی قید نہیں ہے . اس وجہ سے ان کی اصطلاح کے تحت درج بالا تمام حالات و متعلقات پر مشتمل وہ روایات و احادیث بلکہ آثار و اخبار تک حدیث میں داخل ہیں جن کا سرچشمہ کسی بھی طور سے حضور علیہ السلام کی ذات منبع کمالات ہو . اور یہی وجہ ہے کہ سیرت مقدسہ کو علم حدیث کے آٹھ عظیم الشان

حصوں میں سے ایک حصہ قرار دیا گیا ہے۔ اور کتب حدیث میں سے جامع وہ کتاب ہوتی ہے جس میں ذیل کی آٹھ باتوں میں سے ہر ایک کے متعلق روایات کافی اور معتدبہ مقدار میں مروی ہوں ؎

سِیَر آداب و تفسیر و عقائد　　فتن احکام و اشراط و مناقب

چنانچہ کتب احادیث سے متعلق　　ضابطہ کے تحت عام طور پہ صحیح مسلم کو بھی جامع نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں تفسیر سے متعلق احادیث کم اور نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگرچہ ان چند روایات کی وجہ سے صاحب قاموس علامہ مجد الدین فیروز آبادی اپنی سند حدیث متصل کرنے کی خاطر اپنا جو محیر العقول کارنامہ ذیل کے تین شعروں میں بیان کیا ہے ان میں انہوں نے صحیح مسلم کو جامع مسلم کے نام سے یاد کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

قرأت بحمد اللہ جامع مسلم　　بجوف دمشق الشام جوف الاسلام
علی ناصر الدین الامام ابن جهبل　　بحضرة حفاظ مشاهير اعلام
وتم بتوفيق الالٰه وفضله　　قراءة ضبط فی ثلثة ايام ؎

او پہ محیر العقول کارنامہ کہنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ صاحب قاموس نے پوری صحیح مسلم کو ضبط و استحکام کے ساتھ اپنے استاد ناصر الدین ابن جہبل کو صرف تین دن میں سنا کر اپنی سند متصل کر دی۔ اگرچہ اس سے زیادہ حیران کن سرعت قرأت وہ ہے جس کے متعلق علامہ زبیری فرماتے ہیں۔ وقرأت فی تاریخ الذهبی فی ترجمة اسماعيل بن احمد الحيری النيسابوری الضرير ما نصه ۔ وقد سمع عليه الخطيب البغدادی بمكة صحيح البخاری سماعه من الكشميهنی فی ثلثة مجالس ۔ قال وهذا شئ لا اعلم احداً فی زماننا يستطيعه ۔

یعنی صاحب قاموس نے تو تین دن میں پوری صحیح مسلم استاد کو سنا دی تھی۔ لیکن خطیب بغدادی نے اپنے نابینا استاد اسماعیل بن احمد حیری کو پوری صحیح بخاری صرف تین نشستوں میں سنا ڈالی۔ زبیری فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں اس طرح کرنا کسی کے بس کی بات نہیں معلوم ہوتی ؎

ترویج حدیث | میں اس بارہ میں بھی علمی سطح پہ تدوین حدیث وغیرہ باتوں کی مکمل اور مفصل بحث نہیں چھیڑتا ہوں۔ بلکہ صرف معلوماتی انداز میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ حدیث رسول نے وقت گذرنے پر خود ہی ایک بحر مواج کی طرح پھیلنا شروع کر دیا ہے۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ رفع ذکر منظور تھا اس وجہ سے ان کا سلسلہ نہایت وسیع اور طویل و عریض طور پہ رواج پذیر ہوتا چلا گیا۔

امام بخاری فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ کام عروہ ابن شہاب زہری نے کیا

ہے اور انہیں کی زیادہ تر سعی و کوشش سے قرن دوم کے اوائل میں حدیث نے رواج اور فروغ پایا جس کا باعث یہ بنا کہ صحابہ کرام کا ایک بہت بڑا عدد غزوات میں شہید ہوا اور عمر بن عبدالعزیزؒ نے والئ مدینہ ابوبکر ابن حزم کے نام فرمان جاری کیا اور کہا کہ احادیث کو جمع اور محفوظ کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ فرمایا: انی خفت دروس العلم وذھابہ[۵] جس کے ردِعمل میں احادیث کا ذخیرہ جمع اور محفوظ ہونے لگا۔ اور مکہ مکرمہ میں ابن جریج، مدینہ منورہ میں امام مالک، خراسان میں عبداللہ بن مبارکؒ شام میں اوزاعی، کوفہ میں سفیان، بصرہ میں حماد، یمن میں معمر، رے میں جریر۔ ان سب حضرات نے حدیث کو حفظ و روایت، درس و تدریس اور جمع و تدوین کے ذریعہ محفوظ کیا[۶]

یہ تو خیر زمانہ مابعد کا قصہ تھا خود عہد رسالت میں صحابہ کرام نے احادیث کی حفظ و روایت کا کام بڑے وسیع پیمانے پر انجام دیا ہے۔ احادیث کے مستقل روایت کرنے والے صحابہؓ کا شمار علامہ ابن عبداللہ نے تین ہزار پانچ سو بتایا ہے۔ علامہ ابن جوزی نے سات ہزار پانچ سو پر لکھا ہے۔ بعض نے رواۃ صحابہؓ گیارہ ہزار قرار دئے ہیں، علی بن ابی زرعہ نے بلا واسطہ شرف سماع حاصل کرنے والے صحابہؓ کا شمار ایک لاکھ چودہ ہزار بتلایا ہے۔ علامہ ابن جوزی نے کتاب التلقیح میں رواۃ صحابہؓ کی جو فہرست دی ہے اس میں چند کثیر الروایت صحابہؓ کے نام اور ان کے روایات کا خاکہ حسب ذیل ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے	۵۳۷۵
حضرت انس رضی اللہ عنہ سے	۲۲۸۰
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے	۲۲۶۰
حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے	۱۵۸۰
حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے	۱۴۳۰
حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے	۸۴۸

اس درج بالا حفظ و روایت کے علاوہ درس و تدریس اور درایت و فقاہت کے ذریعہ بھی ترویج حدیث کی راہ میں امت مسلمہ کے اسلاف نے جس ہمت و مردانگی اور محنت و زحمت سے کام لیا ہے، اس کی بھی ایک معمولی جھلک ملاحظہ ہو۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کوفہ میں درس حدیث دیا کرتے تھے ان کے دروس میں چار ہزار شاگرد شریک ہوتے ہیں۔ اور چونکہ وہ مجتہدین صحابہؓ میں سے تھے۔ اس وجہ سے

اُن کے دروس سے فقہ واجتہاد کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اور خاص طور پر فقہ حنفی تو عبداللہ بن مسعودؓ کے کشت درخیت کا ثمرہ اور پیداوار ہے۔ گویا وہ اس کھیت کے کاشت کار ہیں اور باقی حضرات اس میں بھی کچھ کام کر چکے ہیں جو ذیل کے دو شعروں میں بیان کیا گیا ہے۔

الفقہ زرع ابن مسعود وعلقمۃ حصادہ ثم ابراھیم دواس

نعمان طاحنہ یعقوب عاجنہ محمد خابز والاٰکل الناس

یعنی فقہ حنفی کا بیج عبداللہ بن مسعودؓ نے بویا اور فصل کو پختہ ہونے کے بعد علقمہ نے کاٹا پھر ابراہیم نے اس کو روندکر دانہ صاف کیا۔ امام ابوحنیفہؒ نے۔ اس کا آٹا تیار کیا۔ امام ابو یوسف نے آٹا گوندا، اور امام محمد نے اس سے روٹی پکائی اور لوگ کھاتے رہے۔

عبداللہ ابن مسعودؓ کے بعد جب درس و تدریس کا یہ رواج چلا ہے تو بنا بہ روایت تذکرۃ الحفاظ علی بن عاصم کے درس میں تیس ہزار سے زیادہ تلامذہ نے شرکت کی۔ یزید بن ہارون کے درس میں ستر ہزار شاگرد شریک ہوتے۔ امام عاصم بن علی بن عاصم کے درس میں حاضرین کا اندازہ ایک لاکھ سے زیادہ لگایا گیا ہے۔ ابو مسلم خراسانی کے درسِ حدیث میں تلامذہ کے علاوہ چالیس ہزار سننے والے ہوا کرتے تھے۔ صرف کوفہ میں اس وقت چار ہزار محدث عالم بنے ہیں۔ امام مالک کے شاگردوں کا شمار اسی ہزار تبلایا گیا ہے۔ سلیمان بن حرب مامون الرشید کے استاد حدیث تھے۔ مامون خود لکھتا تھا اور حاضرین چالیس ہزار تھے۔ امام بخاری سے نوے ہزار تلامذہ نے روایت کی ہے۔ کوفہ میں عثمان بصری شیخ بخاری نے چار ماہ کے عرصہ میں پچاس ہزار احادیث لکھیں اور کہا کہ اگر چاہوں تو مزید ایک لاکھ لکھ سکتا ہوں۔

حفظِ حدیث اس سلسلہ میں فنی اور اصطلاحی طور پر حفاظ حدیث کے کچھ درجات اور منازل مقرر کئے گئے ہیں جو مشہور اور تمام شروح حدیث میں مذکور ہیں۔ چنانچہ ایک لاکھ احادیث یاد کرنے والے کو حافظ اور تین لاکھ کے حافظ کو حجت کہا جانے لگا ہے۔ اور جس کو تمام احادیث مرویہ کے متون، اسناد جرح و تعدیل تاریخ، نسخ وغیرہ کل متعلقہ حالات کا حاوی علم حاصل ہو اس کو حاکم کہتے ہیں۔ اس بارہ میں محدثین کبار کے حفظِ احادیث کا ایک مختصر خاکہ بھی پیش کرتا ہوں۔

ذہبی مزی اور زاہد کوثری کی روایت کے مطابق محمد بن اسحاق ستر لاکھ احادیث کے حافظ تھے۔ ابوبکر رازی ایک لاکھ کے۔ ابوالعباس اور مسلم تین تین لاکھ کے ابوداؤد پانچ لاکھ کے۔ ابوزرعہ سات لاکھ کچھ زیادہ کے۔ امام احمد بن حنبل دس لاکھ کے۔ یحییٰ بن معین بارہ لاکھ کے۔

مالی قربانیاں | مشہور امام حدیث اکبر التابعین عروہ بن شہاب زہری نے تحصیل حدیث کی راہ میں اپنی کل جائداد فروخت کی اور آخر کار گھر کا شہتیر بھی فروخت کیا۔ تحصیل علم کی مہم سر کرنے میں ابن مبارک نے چالیس ہزار درہم۔ یحییٰ بن معین نے دس لاکھ درہم۔ علامہ ذہبی نے پندرہ لاکھ درہم، علامہ ابن رستم نے تیس لاکھ درہم، امام عبداللہ نے ستر لاکھ درہم خرچ کئے۔

امام ابو حنیفہؒ کے متعلق علامہ ابن مسعود بن شیبہ سندھی نے مقدمہ کتاب العلم میں تصریح کی ہے۔ کہ انہوں نے طلب علم میں دو لاکھ رقم خرچ کی تھی۔ ان کے شاگرد امام محمد بن حسن شیبانیؒ کا بیان ہے کہ مجھے اپنے باپ کے ترکہ میں سے تیس ہزار درہم ملے تھے۔ جن میں سے پندرہ ہزار شعر و ادب کی تحصیل میں خرچ ہوئے۔ اور پندرہ ہزار حدیث و فقہ کی تعلیم پر۔ امام محمد کے شاگرد ہشام بن عبید اللہ رازی جو ان سے جامع کبیر کے راوی ہیں ان کے متعلق حافظ ذہبی نے کہا ہے کہ انہوں نے تحصیل علم میں سات لاکھ رقم خرچ کی تھی۔ اسی طرح حافظ کبیر بن سنجر نے تحصیل علم پر نو ہزار اشرفیاں خرچ کیں۔ علامہ ذہبی نے ڈیڑھ لاکھ درہم۔ حافظ ابوبکر جوزی نے ایک لاکھ درہم۔ حافظ حدیث علی بن عاصم کا بیان ہے کہ آغاز طلب علم میں مجھے میرے والد نے ایک لاکھ درہم دیئے اور کہا کہ اس کے عوض ایک لاکھ احادیث یاد کرنا ہوں گی۔ امام بخاریؒ کے والد بہت بڑے سرمایہ دار تھے۔ امام بخاری نے وہ ساری جائداد طلب حدیث میں صرف کر دی۔

بدنی کلفت و مشقت | اس سلسلہ بطور "مشتے نمونہ از خروارے" یہ ہے کہ امام بخاری نے اپنی بیوہ والدہ کے زیر سایہ ترکستان عرب، خراسان ایران کے ایک ایک شیخ کی درسگاہ کو طلب حدیث کیلئے چھان ڈالا۔ محمد بن فرح اموی اندلسی نے یورپ، ایشیا، افریقہ تین براعظموں کو طلب علم کیلئے قطع کیا۔ اور اسپین قرطبہ مصر دمشق صنعا یمن وغیرہ کے مدارس میں پہنچے۔ ابو محمد عبداللہ بن عیسیٰ بن حبیب اندلسی وزارت کے خانوادے سے تھے، اسپین میں علم سے فارغ ہو کر مزید طلب علم کے لئے اسکندریہ مصر پھر عراق میں داخل ہوئے اور بغداد میں مقیم رہے۔ پھر خراسان کی راہ لی، نیشاپور اور بلخ میں قیام کیا۔ پیدا اسپین میں ہوئے اور ۴۸۰ھ کو ہرات میں وفات پاکر وہاں دفن ہوئے۔ ابو قالی عراق کے شہر دیار بکر میں پیدا ہوئے اور طلب علم کے لئے موصل بغداد اسپین گئے اور ۵۷۳ھ کو وفات قرطبہ میں پائی۔ حماسہ کے مشہور شارح علامہ تبریزی نے کتابوں کا پشتارہ پیٹھ پر باندھا اور ابو العلاء المعری کی خدمت میں شام پہنچے اور پسینے سے کتابوں کی یہ حالت تھی کہ ان کا ایک ایک ورق دوسرے سے چپک گیا تھا۔ یہ تمام اس زمانہ کے

مسلمانوں کے کسب علوم کا جذبہ اور طلب صادق کا حال ہے جس میں موجودہ مواصلات اور ذرائع حمل ونقل کا نام ونشان نہ تھا اور اکثر مسافت پیدل طے کرنا پڑتی تھی[۳]

علم الحدیث: عنوان مضمون کے اس جزو دوم کے تحت بھی میں اس وقت صرف علم الحدیث کی مبادی اور چند ذیلی فنون کا ذکر کرتا ہوں۔ اللہ نے توفیق دی تو مزید کچھ معروضات پھر سہی۔ علم الحدیث کی مبادی ثلثہ میں سے اس کی مشہور تعریف تو وہ ہے، جو شیخ عزالدین ابن جماعہ سے منقول ہے[۴] جس کو سیوطی وغیرہ سب ہی محدثین نے ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں: علم الحدیث علم بقوانین یعرف بہ احوال السند والمتن۔ سند حدیث راویوں کے اس مجموعے کا نام ہے، جس کے ذریعہ کسی کو حدیث پہنچتی ہے۔ اور متن حدیث، اختتام سند پر حدیث یا اثر، سنت یا خبر کے الفاظ کو کہتے ہیں۔ علم حدیث کے غرض وغایت کے متعلق بھی ابن جماعۃ کے الفاظ یہ ہیں۔ وغایتہ معرفۃ الصحیح من غیرہ۔ موضوع علم حدیث، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور بعض دیگر محدثین نے ذات الرسول صلی اللہ علیہ وسلم من حیث انہ رسول دنبیؐ۔ قرار دیا ہے۔ اور جیساکہ علامہ سعد الدین تفتازانی[۵] جلال الدین دوانی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ ہر علم وفن بشمار قواعد کلیہ اور مسائل جزئیہ کا مجموعہ ہوتا ہے، جن کو بہ جہت وحدت ہی ایک فن اور علم قرار دیا جاتا ہے۔ گویا فن کے تمام مسائل کسی واحد موضوع اور ایک ہی جہت وحدت کے محور پر گھومتے ہیں، یہاں تک کہ اگر کسی مسئلہ فن کا موضوع براہ راست فن کا موضوع نہ ہو تو اس کو بھی مقررہ عنوان پر لایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح علم حدیث بھی بہت سے علوم وفنون کا منبع اور سرچشمہ ہوتے ہوئے مقررہ جہت وحدت کے لحاظ سے ایک علم کہلایا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اس فن لطیف سے بہت ہی علوم وابستہ یا بہ الفاظ دیگر یہ علم علوم کے ایک کثیر عدد پر حاوی ہے۔ جو کسی نہ کسی درجہ میں وہ علم حدیث ہی کی ایک شاخ ہے اور جس طرح علامہ جلال الدین سیوطی نے علم التفسیر کے بارہ میں اسی عدد علوم مستنبطہ کا ذکر کرکے فرمایا ہے کہ: فھی لا تکاد تنحصر نوعاً علی سبیل الادماج وبا نوعیتہ باعتبار ما ادمجتہ فی ضمنھا لتزاد علی الثلث مائۃ[۶]۔ اسی طرح علم حدیث کے ذیلی علوم میں سے بھی کم از کم ۵۵ علوم کو مدون کیا گیا ہے جن میں سے چند ایک کو علامہ حازمی نے ذیل میں ذکر کیا ہے۔

علم اسماء الرجال، علم اصول الحدیث علم الروایۃ علم الدرایۃ علم تدوین الحدیث علم الناسخ والمنسوخ علم المتفرق الاسناد علم کیفیۃ الروایۃ علم حفظ الحدیث علم المؤتلف والمختلف، علم طبقات الحدیث علم غریب الحدیث علم الجرح والتعدیل علم طرق الحدیث علم الموضوعات،

علم علل الحدیث علم تصحیف الاسماء علم الوحدان علم روایۃ الآباء عن الابناء علم روایۃ الصحابہ عن التابعین۔ علم موضح الاوھام علم الجمع والتفریق علم اسباب ورود الحدیث۔

اس موقع پہ تمام مذکورہ بالا علوم کی تفصیلات وتشریحات نہ تو ممکن ہے اور نہ مقصود، جن میں سے بعض کو علامہ ابن حجر نے نخبۃ الفکر میں بیان فرمایا ہے۔ البتہ علم اسماء الرجال کے بارہ میں ایک تو انگریز محقق ڈاکٹر اسپرنگر کے اس مشہور نوٹ پر قارئین الحق کی توجہ مبذول کرا رہا ہوں جو اس نے اپنی کتاب انگریزی مقدمہ اصابہ مطبوعہ کلکتہ میں لکھا ہے کہ —— مسلمان قوم نے علم اسماء الرجال کے ذریعہ پانچ لاکھ آدمیوں کے حالات قلمبند کر کے وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے جس کی نظیر دنیا کے کسی ترقی یافتہ مذہب میں نہیں ملتی ہے۔ اور مذہب اسلام کی خصوصیات میں سے ایک امتیازی خصوصیت ہے۔

نیز علم اسماء الرجال کے ذریعہ مسلمان قوم نے جس سیاسی انتظام واستحکام اور تحقیق وتجسس کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ وہ بھی نہایت قابل غور ہے جس کے سلسلہ میں ذیل کے تین واقعات بطور نمونہ عرض کرتا ہوں۔

۱۔ عبداللہ حاکم سے ایک شخص نے حدیث بیان کی انہوں نے پوچھا کہ کس سے روایت کرتے ہو؟ جواب دیا کہ فلاں (عبد بن حمید) سے فلاں سن میں۔ اس پر حاکم موصوف نے شاگردوں سے کہا کہ دیکھو یہ شخص عبد بن حمید کے مرنے کے سات سال بعد اس سے روایت کرتا ہے۔

۲۔ خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں یہود نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے اس مضمون کی دستاویز پیش کی کہ یہود خیبر کو جزیہ دینے اور بیگار کرنے سے معاف کر دیا گیا تھا۔ خلیفہ نے محدثین وقت سے تحقیق کرائی اور دستاویز کو جن وجوہات سے جعلی قرار دیا گیا ہے، ان باتوں کا تعلق علم اسماء الرجال سے ملتا ہے۔ ایک یہ کہ اس میں سعد بن معاذؓ کی گواہی درج تھی حالانکہ وہ غزوہ خیبر سے قبل غزوہ خندق میں وفات پا چکے تھے۔ دوسری بات یہ کہ دست آویز کا کاتب حضرت معاویہ بن ابی سفیان کو بتایا گیا تھا۔ جب کہ وہ اس وقت مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے۔

۳۔ اس افید ونافع علم کے فوائد میں یہ بھی ایک واقعہ پیش آیا کہ خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں عبدالکریم وضاع احادیث کا جرم (وضع احادیث) جب ثابت ہوا اور خلیفہ نے اس کے قتل کرنے کا حکم دیا تو اس نے کہا کہ ان چار ہزار احادیث کا تم کیا کرو گے جو میں نے بنا کر اطراف عالم میں پھیلا دی ہیں۔ اس پر خلیفہ نے فرمایا کہ عبداللہ ابن مبارک اور فزاری ایک ایک

صرف کر کے لوگوں کو بتاویں گے۔[۱۸]

مضمون کے آخر میں یہ عرض کرنا شاید بے جا نہ ہو کہ علوم شرعیہ میں علم حدیث کی حیثیت کسی عمارت کی خشت اوّلین اور سنگ بنیاد کی ہے اور اگرچہ ادلۂ شرع میں سب سے مقدم اور معظم تو کتاب اللہ ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کا صحیح اور قابل عمل فہم و سمجھ، منطوق و مفہوم، تاویل و تفسیر صرف وہی ہو سکتی ہے جو حدیث اور علم الحدیث کی راہ نمائی میں ہو۔ گویا یہاں دانشوران یورپ اور حکماء یونان سے ذاتی نتائج فکر اور خود ساختہ تفسیر و تشریح کا کوئی وزن نہیں ہے ؎

بہ نیم جو نہ خرم علم و حکمت یونان　　چہ پیش من ز علوم محمد عربی ہست

بلکہ قرآن کریم کا معنی بیان کرنا قرآن والے کے ذمہ لگا کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ لتبین للناس ما نزل الیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ۔ اندریں حالات علم حدیث ہی تمام دینی اور مذہبی علوم کا سرچشمہ و سرتاج اور منبع و مرجع ہے۔ اور جو علم و فن کہ حدیث کی روشنی میں یا اس کے خادم اور آلہ کی حیثیت سے ترتیب و تدوین پا گیا ہے۔ وہ تو بیشک علم و فن کہلانے کا مستحق ہے، مگر جس علم کو اس جوہر عزیز اور متاع گرانمایہ سے براہ راست یا بالواسطہ کوئی سروکار نہ ہو وہ حقیقۃً علم نہیں ہے۔ وحق ما قیل ؎

العلم ما قیل فیہ حدثنا　　وما سوی ذالک وسواس الشیاطین

حوالہ جات :- [۱] مقدمہ فتح الملہم ص۱　[۲] مقدمہ فتح الملہم ص۲۵　[۳] تاج العروس ۵، ص۱۴

[۴] تاج العروس ج ۱، ص۱۹۲　[۵] فیض الباری ۱، ۶　[۶] فیض الباری ۵، ۱۰

[۷] رد محتار ص۵ طبع جدید　[۸] تذکرہ ص۱۹۲　[۹] تذکرہ ص۲۶۴　[۱۰] تاریخ حدیث عبدالکریم

[۱۱] تذکرۃ الحفاظ ص۲۵۵　[۱۲] تذکرۃ الحفاظ ص۲۸۹　[۱۳] حضرت الاستاد علامہ شمس الحق صاحب افغانی بحوالہ کتاب الرشید ساہیوال ص۱۰۱/۹　[۱۴] فتح الملہم ص۲　[۱۵] سلول ص۲۳

[۱۶] اتقان ج ۱ ص۸　[۱۷] تاریخ حدیث عبدالکریم ص۱۰۷

نور محمد سٹوڈنٹ بی۔ ایس۔ سی
اسلامیہ کالج پشاور

نظریۂ پاکستان نصابِ تعلیم اور ہم

کسی قوم کیلئے وہی نصابِ تعلیم صحیح ہو سکتا ہے، جو اس قوم کے ذوقِ طبعی کے موافق ہو۔ اور دونوں کے درمیان مناسب ہم آہنگی کا پایا جانا ضروری ہے۔ دراصل "تعلیم ان مخفی قوتوں کے اظہار کا نام ہے جو فطرت نے انسانی طبیعت میں ودیعت کی ہیں۔ اور تعلیم کی بنیاد یہ ہے کہ نقد و اختیار و توسیع معلومات کے ذریعہ سے انسانی قوتوں کو ترقی دی جاسکے۔"

تعلیم کے متعلق مندرجہ بالا رائے مولانا آزاد نے "مسلمانانِ ہند اور گورنمنٹ کی تعلیمی حکمت عمل کے تحت" الہلال "۴ رجون ۱۹۱۳ء میں تبصرہ فرماتے ہوئے پیش کی۔

تعلیم کے متعلق ایک یورپی مفکر ہنری پسٹالوزی (متوفی ۱۸۲۷ء) نے کہا تھا کہ "آج کل تعلیم کے جو طریقے رائج ہیں ان کے اتباع نے یورپ کو بڑی سخت غلطی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ غلطی ہی نہیں وہ اپنے آپ سامانِ ہلاکت میں ہے۔ ایک طرف تو اعلیٰ درجے کے علوم و فنون و صنائع میں ترقی کر کے فلک العرش پر پہنچ گیا ہے اور دوسری طرف وہ تعلیم طبعی کی وہ بنیاد ہی کھو بیٹھا ہے جس کا مدعا یہ ہے کہ سب کو ایک تعلیم دینی چاہئے۔ اور سب کی تعلیم ان کے ذوقِ طبعی کے موافق ہونی چاہئے۔" اور "تعلیم صحیح ایک ایسے درخت کے مشابہ ہے جو کسی نہر کے کنارے اپنی تناوری اور سرسبزی کی بہار دکھا رہا ہو۔ یہ درخت کس چیز سے پیدا ہوا۔۔۔؟ ایک ننھے اور حقیر سے بیج نے اس کو درخت بنایا ہے۔ جو درخت کے تمام افعال و خواص پر حاوی ہے۔ اور جو اس وقت خاک میں چھپا پڑا ہے۔ انسان بھی اسی درخت کے مشابہ ہے۔ بچوں کو دیکھئے ان میں وہی تمام قوتیں مخفی و مستور ہیں جو ان کی زندگی میں نمایاں ہوتی ہیں۔ انسان کی تہذیب صرف ادبی اور اخلاقی

حالت کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں۔"

ماہرین تعلیم کی مندرجہ بالا آراء کی روشنی میں ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ ہمارا نصاب تعلیم کہاں تک ہماری اس معاملے میں مدد کرتا ہے۔ کہ ہم زیور تعلیم سے آراستہ ہونے کے بعد ایک کامل مسلمان بنتے ہیں۔

ہم پاکستانی ایک قوم ہیں۔ جس کی تشکیل آج سے چودہ سو برس پہلے پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی جس کی اساس کلمۂ توحید۔ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ پر رکھی گئی تھی۔ (اللہ کی وحدانیت اور حضرت محمدؐ کی رسالت (ختم نبوت) کا اقرار ویقین) دراصل اس کلمہ کی اساس بھی خود نبی کی ذات ہے۔ کیونکہ نبی کی حیثیت تسلیم کرنے کے بعد اس کلمہ کو سچا اور قابل عمل مانا گیا۔ بقول علامہ اقبالؒ " اسلام بحیثیت دین خدا کی طرف سے ظاہر ہوا اور بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسول کریمؐ کی شخصیت کا مرہون منت ہے۔ (تشکیل جدید الہیات اسلامیہ)

زمانہ گذرتا گیا حتیٰ کہ بیسویں صدی عیسوی آگئی جس میں کہ ایک دفعہ پھر حق وباطل کا معرکہ بپا ہوتا تھا۔ آخر علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام، خطبات اور خطوط کے ذریعہ اس مردہ قوم میں جان ڈالی اور فرمایا کہ قوم وطن سے نہیں بلکہ عقائد و نظریات کی ہم آہنگی سے وجود میں آتی ہے۔ انہوں نے ایک خط میں فرمایا: "جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے، اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے۔ جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔" (فیضان اقبال مرتبہ شورش کاشمیری)

دنیا کے سامنے علامہ موصوفؒ نے یہی نظریہ پیش کیا کہ مسلمان، ہندوؤں سے ایک علیحدہ قوم ہیں۔ (جو آگے چل کر نظریۂ پاکستان بنا) جس کو انہوں نے (اپنے پیشروؤں کے مطابق) ملت اسلامیہ قرار دیا۔ اور یہ بات ان کے کلام میں روز روشن کی طرح بالکل واضح ہے کہ ملت کی اساس نبوت پر ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے ہر اس نظریہ کو اور ہر اس الہام کو جو ملت میں پھوٹ ڈالے گمراہ قرار دیا ہے ؎

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

ان کا یہ فرمان آج تک امت مسلمہ نے نہیں بھلایا (البتہ حکمرانوں نے اس اصول کو پس پشت

ڈالے رکھا) اب بھی علامہ اقبالؒ کی روح تڑپ تڑپ کر فرزندانِ اقبال کو صدا لگا رہی ہے کہ اس نظریہ کو اس اصول کو معاشرے پر عملاً نافذ کیا جائے، ان کا قول تھا۔۔۔ ع

قوموں کی تباہی ہے مرکز سے جدائی

اور وہ نبوت کو ہی مسلمان قوم کا مرکز قرار دیتے تھے۔

ہمیں یہاں منطقی دلائل سے نہیں بلکہ عقیدے کے طور پر یہ بات جان لینی چاہیے کہ کسی قوم کو دنیا کی دوسری قوموں کی صف میں اپنی حیثیت منوانے کیلئے (لازمی طور پر) اس نظریہ کو اپنے اوپر لاگو کرنا ہوتا ہے۔ کہ جس کی وجہ سے وہ ظہور میں آئی ہو۔ قوم پر ہر ایک چیز قربان کی جا سکتی ہے۔ مگر نظریہ و اصول کی بقا کی خاطر قوم اپنی جان کی بازی لگا کر بھی اس کو زمانہ میں سر بلند رکھتی ہے۔ کیونکہ اسی نظریہ و اصول کی وجہ سے چند منتشر افراد مل کر قوم کی تشکیل دیتے ہیں۔ اب اگر کوئی قوم اس نظریہ سے غداری کرتی ہے۔ (خواہ وہ کھلے بندوں ہو یا چوری چھپے) تو (بہر حال) ایک نہ ایک دن اس کا وجود نا مسعود صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتا ہے۔ کیونکہ قانونِ فطرت یہی ہے۔

ہماری قابلِ احترام گورنمنٹ اب اس طرف متوجہ معلوم ہوتی نظر آ رہی ہے کہ جتنا جلدی اور جسطرح ہو سکے نظریۂ پاکستان کو اپنے ملک میں عملاً نافذ کر دیا جائے۔ اور نصابِ تعلیم کو نظریۂ پاکستان کے مطابق بنایا جائے۔ (جیسا کہ پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرز صاحبان کے اجلاس منعقدہ زیرِ صدارت سیکرٹری تعلیم جناب زیڈ۔ اے۔ ہاشمی قرار پایا ہے کہ نصاب کو جلد از جلد نظریۂ پاکستان کے تقاضوں کے مطابق بنایا جائے گا۔) رپورٹ پی۔ پی۔ آئی مورخہ ۲۶ر جولائی ۱۹۷۱ء۔

گورنمنٹ کے اس بروقت فیصلہ کو قوم تحسین کی نگاہوں سے دیکھتی ہے اور امید رکھتی ہے کہ اب کی بار گورنمنٹ مخلصانہ طریق سے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر وہی نسخۂ کیمیا استعمال کرے گی جس کو کہ علامہ اقبالؒ نے آج سے چند برس پہلے قوم کے لئے تجویز فرمایا تھا۔ گورنمنٹ کو چاہیئے کہ ان فرقوں اور تحریکوں کو جو حضرت محمدؐ کی ختم المرسلینی پر امت کے اجماع کے مطابق یقین نہیں رکھتیں اور جو قولاً یا فعلاً نظریۂ پاکستان کے مخالف ہیں، ان پر نہ صرف پابندی لگانا ضروری ہے۔ بلکہ ان کو ملت سے کاٹ دیا جائے، کیونکہ یہی وہ ناسور ہیں جن کی وجہ سے پوری قوم ابتلا میں پڑی درد و کرب سے کراہ رہی ہے۔ جن لوگوں کا یہ قول ہے کہ انتخابات جداگانہ ہوں۔ وہ بھی نظریۂ پاکستان کے مخالف ہیں۔۔۔۔ کیا نظریۂ پاکستان یہی تھا کہ پاکستان کے تمام باشندے پاکستان کے شہری بھی ہوں گے قطع نظر اس کے کہ وہ مسلم ہیں یا غیر مسلم۔ نہیں نہیں بلکہ نظریۂ پاکستان یہ تھا

کہ مسلمان ایک الگ قوم ہے۔ نہ یہ کسی دوسری قوم میں مدغم ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی کوئی دوسری قوم اس میں مدغم ہو کر حقوقِ شہریت حاصل کر سکتی ہے۔ اب جب کہ پاکستان وجود میں آچکا ہے۔ تو اس کے شہری (نظریۂ پاکستان کے مطابق) صرف اور صرف وہی لوگ ہونے چاہئیں جو حضرت محمدؐ کی نبوت کا (اجماعِ امت کے مطابق) اقرار کرتے ہیں۔ قرآن اس بات کی یوں تصدیق کرتا ہے۔ یاایھا الذین امنوا لا تتخذوا بطانۃ من دونکم۔ (آل عمران ۱۱۸) ترجمہ: اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے سوا دوسروں کو شریک راز نہ بناؤ۔

قوم اس تاریخی اعلان کیلئے دن گن رہی ہے کہ کب ان کے ذوق طبعی کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔ گو کہ یہ فیصلہ ایک نہایت مشکل کام نظر آتا ہے۔ مگر جتنا مشکل ہے۔ اس سے کئی گنا اشد ضروری ہے۔ کیونکہ اب (جس حال میں کہ ہم ہیں) یہی قدم ہماری ڈگمگاتی کشتی کو گرداب سے باہر نکال سکتا ہے۔ بلکہ مستقبل میں آنے والی نسلوں کے لئے بھی مشعلِ راہ بن کر ان کو اوجِ ثریا تک پہنچانے میں مدد دے گا ۔۔۔ قرآن ایسے لوگوں کو بشارت دیتا ہے۔ انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین۔ اور بقول اقبال مرحومؒ ۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں   یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اس اقدام کے بعد دنیا میں ہونے والے تمام فیصلے ہماری مرضی کے بغیر نامکمل اور ادھورے رہ جائیں گے۔ اور قدرت کی طرف سے وہ نعمتیں ہم پر اتریں گی جن کا ہم گمان بھی نہیں کر سکتے۔

اور ہاں! اگر اس عقیدے اور نظریہ سے ہٹ کر یا بے جا حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے اس میں کسی قسم کی ترمیم یا کمی بیشی کی گئی یا ان لوگوں کو جو اس عقیدے اور نظریہ پر ایمان نہیں رکھتے کسی قسم کی رعایت دی گئی تو پھر اس کا انجام نہایت دردناک ہوگا۔ اب تک ہم نے اس نظریہ کو پسِ پشت ڈال کر جو ملی، اقتصادی اور سیاسی نقصانات اٹھائے ہیں اگر ان کی فہرست بنائی جائے تو کاغذ اپنی وسعتوں کے باوجود اپنا دامن سمیٹ لے گا۔ اور معاشرہ جس ڈگر پر چل نکلا ہے اس کا اندازہ تو اہل عقل و شعور ہی لگا سکتے ہیں۔ کیا مشرقی پاکستان کے خونچکاں واقعات نے ہمارے دماغ کی کھڑکیاں نہیں کھولیں۔ کیا اب بھی ہم ان سے سبق حاصل نہیں کر سکتے۔ منطق و فلسفہ کے ماہر ہی نہیں طالب علم تک سبھی جانتے ہیں کہ واقعات خود بخود رونما نہیں ہوتے، ان کا سبب ضرور ہوتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ان تمام واقعات سے نصیحت حاصل کریں تاکہ دنیا و آخرت میں کامیاب و سرخرو ہو سکیں ـــــــــ

سفرِ افغانستان کے پراگندہ نقوش

ایڈیٹر کے قلم سے

محمود غزنویؒ کے دیس میں

بلخ کے کھنڈرات یا علم و حکمت کے دفینے

یہ ابراہیم ادھم کا قصہ تھا بارہا جس کے سننے کا اتفاق ہوا مگر رات کی مجلس میں سنانے والا مثنوی مولانا روم کا ایک دلدادہ تھا۔ پڑھنے کا عجب انداز، ڈوب کر سنا رہا تھا۔ عجیب سوز و گداز، اور لکھنے والے مولائے روم ــ مثنوی نے جنہیں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ اور جن کا پاکیزہ خمیر بلخ ہی کی سرزمین سے اٹھایا گیا، آباد و اجداد اسی بلخ کے رہنے والے تھے۔ صدیوں تک عقلیت والحاد کی بنیادوں پر کاری ضرب لگانے والا جلال الدین ۶ ربیع الاوّل ۶۰۴ھ کو اسی شہر کے ایک خدا رسیدہ ذی اثر بزرگ محمد بہاؤ الدین کے گھر میں پیدا ہوا۔ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی شان و شکوہ کی بے وقعتی اور راہِ عشق میں ترکِ مال و وطن ورثے میں پایا تھا۔ ان کے والد بزرگوار کے اثر و رسوخ سے جب سلطانِ وقت خوارزم شاہ گھبرا گیا تو خزانوں کی کنجیاں بھی ان کے قدموں میں ڈال دیں کہ دلوں کی حکمرانی تو تجھے حاصل ہے۔ میرے پاس ان کنجیوں کے سوا رہ کیا گیا ہے۔؟ آپ نے جواب میں کہا ہم سرستانِ بادۂ الست کو ان چیزوں سے کیا سروکار۔ سلطنت بھی تجھے مبارک ہو اور خزانے بھی۔ آپ کو ناگوار ہے تو فقیر چلا جاتا ہے۔ مگر جاتے جاتے خطرہ کا الارم دے گئے کہ میرے بعد لشکرِ تاتار آ رہا ہے۔

الغرض اعلاءِ کلمۃ اللہ کی خاطر تاج و تخت کو حقیر سمجھنا اور حقیقی عشق تو مولانا روم کو ورثے میں ملا تھا۔ پھر ابراہیم ادھم کے ذکر میں وہ کب صاحبِ قال رہتے۔ صاحبِ حال تھے۔ نہ صرف اسی واقعہ کے بیان میں بلکہ ان کی مثنوی تو اوّل تا آخر مردہ قلوب کے لئے پیغامِ حیات ہے۔ اور کیوں نہ ہو جب اس کا سرچشمہ وہ عشق آفریں طبیعت ہے جو اپنی پرجوش اور پرسوز حالت سے اس طرح پردہ

اٹھاتے ہیں ؎

شعلہا آخر زہر موئیم دمید از رگ اندیشہ ام آتش چکید

مقام عشق و بے خودی میں ہر تن ہو گویا ہے کہ ؎

در جہاں یارب ندیم من کجاست نخل سینایم کلیم من کجاست

اس آتش فشاں سے نکلے ہوئے شعلے تھے جنہوں نے صدیوں تک عقل پسندی، تجدد اور خرمن الحاد و ظاہر پرستی کو خاک بنائے رکھا۔ اور مولائے روم کے الہامی نغمے تھے جن کی حرارت و شدت نے عالم اسلامی کے فکری تعطل اور جمود کو پگھلا کے رکھ دیا۔ بہر حال مثنوی کیا ہے ۔۔۔ محبت کا لافانی پیغام سوز و گداز اور جذب و مستی کی متاع اور ایمان و غیب کے لئے اپنے وقت کا ایک نیا علم الکلام۔ جس نے کتنوں کو راہ ہدایت دکھائی اور کتنوں کو منزل تک پہنچا کے چھوڑا۔ سچ کہا ہمارے فلسفی اور صاحب دل شاعر اقبالؒ نے کہ وہ بھی انہی لوگوں میں تھے جنہوں نے مثنوی سے نیا فکر، نیا جوش اور نئی زندگی پائی ؎

پیر رومی مرشد روشن ضمیر کاروان عشق و مستی را امیر

نور قرآں درمیان سینہ اش جام جم شرمندہ از آئینہ اش

رومی آں عشق و محبت را دلیل تشنہ کاماں را کلامش سلسبیل

ایک پورے عہد کے لئے مجدد کا یہ تجدیدی کارنامہ آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ مگر وہ جنہیں اقبالؒ نے پیر رومی کو رفیق راہ بنانے کا مشورہ دیا تھا، ان میں سے کتنے ہیں جنہیں اس کی خبر تک بھی ہے ۔۔؟ جن کی ساری مجلس آرائی آرٹ، ثقافت، جنسیات، افسانوں اور مخش ڈراموں پر تو وقت ہے۔ انہیں مثنوی جیسے حیات آفرین پیغام سوز و گداز کی لذت کیا معلوم۔ مثنوی کی جگہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو نے لی؛ قلب و نظر کی تسکین مولانائے روم کی جگہ شیکسپیر، ملٹن اور گوئٹے میں ڈھونڈی جانے لگی۔ ہمارے بزرگ مثنوی جیسے پاکیزہ علم و ادب سے عقل و فلسفہ کی کدورتیں دور کرتے تھے۔ آج ہم میکیاولی، ڈارون، فرائڈ کی ہلاکت گاہوں میں اپنی نگاہ و بصیرت کا علاج ڈھونڈ رہے ہیں۔ بیماریوں کے سرچشموں سے صحت کی تمنا مسلمان قوم کا شیوہ تو نہ تھا ۔۔۔ یورپ کے دبستان سے دلوں کی سوز نگاہوں کی پاکی، فکر و نظر کی سلامت روی کی توقع رکھنا ایک ایسی بات ہے جو اس وقت

پورے عالم اسلام پر خندۂ استہزا کر رہی ہے۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ذکر ابراہیم ادھمؒ کے والد ماجدؒ کے مزار پر حاضری کا ہو رہا تھا۔ مزار کے کھنڈرات کسی زمانہ میں عمارت کے حسن و شوکت کی غمازی کر رہے تھے۔ اب صرف شکستہ طاق اور گنبد رہ گیا ہے۔ سامنے ایک قدیم اور بلند و بالا چنار کا درخت ہے جو ہماری عظمتِ رفتہ کی حسرتناک تصویر بنا نہ معلوم کب سے "عہدِ رفتہ" کو آواز دے رہا ہے۔ اور گویا مثنوی کے انداز میں نالہ کناں ہے ؎

ایھا النور فی الفواد تعال — غایۃ الوجد والمراد تعال

ایھا السابق الذی سبقت — منک مصدوقۃ الوداد تعال

ایک طرف سے آواز آئی کہ ؎

نشان لالۂ این باغ از کہ می پرسی — برو کہ آنچہ تو دیدی بجز خیال نماند

رہرو نے چنار کے درخت سے گذرنے والوں کا کچھ حال دریافت کرنا چاہا کہ اتنے میں میرؔ کے الفاظ میں ؎

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں — مشتِ غبار کے صبا نے اڑا دیا

(جاری ہے)

(بقیہ: شریعت اسلامیہ)

آبادی کے ملک پر حکمرانی کر سکیں (غالباً یہ اس وقت کا واقعہ ہے۔ جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں تمام ملک نہیں آیا تھا۔) جسے آجکل رائے کی بادشاہت کہتے ہیں اس لئے جونہی وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو تعلیم کی تاثیر سے ان کے قومی اور مذہبی تفرقے دور ہو جائیں گے۔ جس کے ذریعہ سے ہم نے اب تک اس ملک کو اپنے قبضہ میں رکھا ہوا ہے۔ یعنی مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف کرنا۔ اور علیٰ ہذا القیاس تعلیم کا یہ اثر ضرور ہوگا۔ کہ ان کے دل بڑھ جائیں گے۔ اور انہیں اپنی طاقت سے آگاہی ہو جائے گی۔

الغرض برطانیہ نے ابتدا ہی سے علم اور وراثتِ علم کو اپنی اغراضِ فاسدہ اور جابرانہ پالیسی کی بنا پر فنا کر دیا۔

علمی و فکری زندگی کے بارہ میں اکابر اہلِ علم اور مشاہیر ملک و ملت کی خدمت میں بھیجے گئے سوالنامہ کے جوابات آنے لگے ہیں مگر اب ان تمام مضامین کو ایک ہی شمارہ میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اس لئے پیشِ نظر شمارہ سے یہ سلسلہ مضامین شروع نہیں کیا جا سکا۔ (ادارہ)

جناب مصطفیٰ عباس ایم اے (مرحوم)

ابن جریر | تیسری صدی ہجری کے عظیم مؤرخ اور مفسّرِ قرآن ابنِ جریر کا نام محمد اور کنیت ابوجعفر ہے۔ اپنے والد جریر کی نسبت سے ابنِ جریر اور وطن طبرستان کی نسبت سے طبری کہلاتے ہیں۔ آپ کے دادا کا نام یزید اور پردادا کا نام غالب تھا۔

بیشتر تذکرہ نگاروں نے اس امر پر اتفاق کیا ہے۔ کہ ابن جریر طبری ایران کے قدیم صوبہ طبرستان کے شہر آمل میں پیدا ہوئے۔ آپکا سالِ ولادت ۲۲۳ھ ہے۔ ابنِ خلکان نے ۲۲۴ھ لکھا ہے۔ ابنِ ندیم نے لکھا ہے کہ امام ابنِ جریر طبری ۸۷ سال کی عمر میں ۳۱۰ ہجری میں فوت ہوئے۔ اگر ابنِ ندیم کے بیان کو درست مانا جائے تو آپ کا سالِ ولادت ۲۲۳ھ بنتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف بریٹانیکا میں آپ کا سالِ ولادت ۸۳۸ء مذکور ہے جو ۲۲۳ھ کے مطابق ہے۔ دی خویہ جس نے پہلی بار تاریخ ابن جریر کو زیورِ طباعت سے آراستہ کیا اس نے ابنِ جریر کی عمر ۸۷ سال اور سنِ وفات ۹۲۳ء لکھا ہے۔ اس طرح آپ کا سالِ ولادت ۸۳۶ء بنتا ہے۔ حالانکہ دی خویہ (DE GOEJE) نے دوسری جگہ سالِ ولادت ۸۳۸ء تسلیم کیا ہے۔ سید علی بلگرامی کے نزدیک آپکا سالِ ولادت ۸۳۹ء ہے۔ جو ابنِ خلکان کے بیان کردہ سالِ ولادت (۲۲۴ھ) کے مطابق ہے۔

طبرستان اور خاص کر امام ابنِ جریر طبری کا مولد (آمل) مرکزِ خلافت (بغداد) سے دور واقع ہونے کے باوجود علمی مرکز تھا۔ امام موصوف نے ابتدائی تعلیم اسی شہر آمل میں حاصل کی۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ نے سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا۔ آمل میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد امام ابنِ جریر نے۔ ایران، عراق، شام اور مصر کی سیاحت

کی اور ان ملکوں میں واقع علمی مراکز سے استفادہ کیا اور اس وقت کے علماء اور فضلاء کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان دنوں مرکزِ خلافت بغداد میں امام احمد بن حنبل کی علمی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ ۲۴۱ھ میں جبکہ ابن جریر کی عمر ۱۸ یا ۱۹ سال تھی، امام موصوف کی خدمت میں حاضری کیلئے بغداد پہنچے لیکن مراد پوری نہ ہوئی۔ آپ کی آمد سے چند روز قبل امام احمد بن حنبل وفات پا چکے تھے۔ اور ابن جریر اہلِ سنت کے آخری امام کی زیارت سے محروم رہ گئے یہ محرومی آنے والے دور میں حنابلہ اور جریریہ کے تعلقات کے لئے فالِ بد ثابت ہوئی۔

ابو محمد فرغانی نے لکھا ہے کہ جب ابن جریر پہلی بار بغداد پہنچے تو آپ کے پاس زادِ سفر کے طور پر کچھ نقدی وغیرہ تھی جو چوری ہو گئی۔ اور آپ تنگ دست ہو گئے۔ آپ نے اپنے استعمال کے کپڑے اور بعض دوسرا ضروری سامان بیچ کر وقت گذارنا شروع کیا۔ کئی بار فاقہ کشی بھی کی۔ اسی حالت میں دن گذر رہے تھے کہ خلیفہ المتوکل کے وزیر ابو الحسن عبید اللہ بن یحییٰ بن خاقان نے آپ کو اپنے بیٹے کا اتالیق مقرر کر دیا۔ اسطرح ۱۸، ۱۹ سال کی عمر میں آپ نے وقت کے لحاظ سے خاصی کامیابی حاصل کر لی۔ چار پانچ سال تک آپ عبید اللہ بن یحییٰ کے بچوں کے استاد رہے۔ اس عرصے میں سوائے معمولی تنخواہ کے کسی سے کوئی ہدیہ یا تحفہ قبول نہ کیا۔ جب کسی نے پیش کش کی تو فرمایا مجھے معقول تنخواہ ملتی ہے۔ اس لئے مزید کسی چیز کی حاجت نہیں ——

۵ یا ۶ سال بغداد میں گذارنے کے بعد امام ابن جریر طبری نے مصر کا رخ کیا۔ ان دنوں مصر میں امام شافعیؒ کے مقلدوں کی اکثریت تھی۔ آپ پندرہ سال تک مصر میں رہے۔ اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ نے مصر کے اہلِ علم حضرات سے استفادہ کیا۔ اور آپ کے تلامذہ آپ سے مستفید ہوتے رہے۔ ۱۵ سال مصر میں گذارنے کے بعد ۸۷۰ عیسوی میں واپس بغداد تشریف لائے۔ اور پھر عمر بھر بغداد ہی میں رہے۔

مصر کے سفر سے واپس آکر امام ابن جریر نے بغداد میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ہر وقت سینکڑوں کی تعداد میں اہل علم آپ سے استفادہ کرتے اور تلامذہ کا حلقہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ اسی زمانے میں آپ نے وہ عظیم الشان کتاب ترتیب دی جسے تاریخ طبری کے نام سے دنیا جانتی ہے۔ اور جو ہمارے مضمون کا اصل موضوع ہے۔

تذکرہ نگار اس امر پر متفق ہیں کہ امام ابن جریر طبری کا سالِ وفات ۳۱۰ھ بمطابق ۹۲۳ء

ہے۔ آپ بغداد میں فوت ہوئے اور بغداد ہی میں مدفون ہیں۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ آپ ۲۷ شوال ۳۱۰ھ بروز ہفتہ شام کے وقت فوت ہوئے۔ مستشرقین نے آپ کا سال وفات ۹۲۳ء لکھا ہے۔ البتہ امیر علی نے اپنی کتاب A SHORT HISTORY OF THE SARACENS میں اور سید علی بلگرامی نے تمدن عرب کے حاشیہ پر آپکا سال وفات ۹۲۲ء لکھا ہے۔ ابن خلکان نے آپکا بغداد میں مدفون ہونا لکھا ہے۔ اور ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ :

"میں نے مصر میں ایک قبر دیکھی ہے جسکی لوگ زیارت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بڑے مفسر قرآن اور مؤرخ کی قبر ہے۔ اور اس کے کتبہ پر لکھا ہے،

"ھذا قبر ابن جریر الطبری۔"

ابن خلکان کا خیال ہے کہ ابن جریر طبری تو بہرحال بغداد ہی میں مدفون ہیں۔ اور نہ معلوم مصر میں لوگ جس قبر کی زیارت کرتے ہیں یہ کون صاحب ہیں۔

تصانیف علامہ ابن جریر طبری ایک جید عالم، فقہ کے امام، مفسر قرآن، عظیم مؤرخ اور ادیب تھے۔ آپ نے بیسیوں کتابیں لکھی ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے قلم میں بے پناہ روانی تھی۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ابن جریر نے جس قدر تصانیف و تالیفات چھوڑی ہیں، ان سب کے اوراق کو آپ کی پوری زندگی کے دنوں پر پھیلایا جائے تو معلوم ہوتا ہے، کہ آپ روزانہ کم و بیش چالیس ورق لکھا کرتے تھے۔ بچپن اور سفر کے ایام نکال دئے جائیں تو ساٹھ ورق یومیہ اوسط بنتی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ آپ کی تفسیر اور تاریخ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ موجودہ کتابیں اصل کا دسواں حصہ ہے۔ قاہرہ کی مطبوعہ تاریخ طبری تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ گویا اصل میں تیس ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی تھی۔ یہی حال تفسیر کا ہے۔ کشف الظنون میں لکھا ہے کہ :

"ابن جریر طبری نے اپنے تلامذہ سے پوچھا کہ کیا تاریخ لکھنا چاہتے ہو۔؟ تلامذہ نے عرض کیا ضرور لکھنا چاہتے ہیں۔ البتہ فرمائیں جو تاریخ آپ لکھوائیں گے وہ کسقدر طویل ہے۔؟ فرمایا : انہ ثلاثون الف ورقۃ۔ تلامذہ نے گھبرا کر عرض کیا اس قدر طویل کتاب کے نقل میں ہماری عمریں صرف ہو جائیں گی۔ استاد نے فرمایا : انا للہ ماتت الھمم۔ پھر آپ نے اپنی کتاب مختصر کر دی۔"

عبدالوہاب بن السبکی نے طبقات الکبریٰ میں امام ابن جریر طبری کی مندرجہ ذیل تصانیف

کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ کتاب التفسیر۔
۲۔ کتاب التاریخ۔
۳۔ کتاب القرآت والعدد والتنزیل۔
۴۔ کتاب اختلاف العلماء و تاریخ الرجال من الصحابۃ والتابعین۔
۵۔ کتاب احکام شرائع الاسلام۔
۶۔ کتاب الخفیف۔
۷۔ کتاب التبصیر فی اصول الدین۔

اسی تذکرہ نگار نے امام ابن جریر کے اساتذہ کے حسب ذیل نام گنوائے ہیں۔

۱۔ محمد بن عبدالملک بن ابی الشوارب
۲۔ اسحاق بن ابی اسرائیل۔
۳۔ اسماعیل بن محمد الفزاری
۴۔ ابی کریب
۵۔ ھناد بن السری
۶۔ الولید بن شجاع
۷۔ احمد بن منیع
۸۔ محمد بن حمید الرازی
۹۔ یونس بن عبد الاعلیٰ۔

اور جن حضرات نے ابن جریر سے روایات لی ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ ابو شعیب الحرانی
۲۔ مخلد الباقرجی
۳۔ الطبرانی
۴۔ عبدالغفار الحصینی
۵۔ ابو عمر بن حمدان
۶۔ احمد بن کامل وطائفۃ سواھم

افکار ابن جریر علامہ ابن جریر طبری کے افکار و نظریات کے بارے میں متاخرین نے باہم اختلاف کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے :

۱۔ آپ امام شافعیؒ کے مقلد تھے ۔

۲۔ آپ ایک مستقل مکتب فکر کے امام تھے ۔

۳۔ آپ کسی حد تک شیعہ عقائد کے حامی تھے ۔

۴۔ آپ خالص شیعہ تھے ۔

جرجی زیدان نے اپنی کتاب " تاریخ آداب اللغۃ العربیہ " کے تیسرے حصہ میں لکھا ہے :

کان علی مذہب الامام الشافعی ثم اختار لنفسہ مذہبا فی الفقہ تبعہ فیہ جماعۃ من العلماء و وضعوا فیہ الکتب ۔ یعنی ابن جریر امام شافعیؒ کے مذہب پر تھے بعد میں فقہ میں الگ مسلک اختیار کر لیا ۔ اور علماء کی ایک جماعت نے آپ کی تقلید کی اور آپ کے فقہی مسلک پر کتابیں تالیف کیں ۔

شبلی نعمانی نے اپنی تالیف سیرۃ النبی حصہ اوّل میں لکھا ہے :

" تاریخی سلسلہ میں سب سے جامع اور مفصل کتاب امام طبری کی تاریخ کبیر ہے ۔ طبری اس درجہ کے شخص ہیں کہ تمام محدثین ان کے فضل و کمال ۔ وثوق اور وسعت علم کے معترف ہیں ۔ ان کی تفسیر احسن التفاسیر خیال کی جاتی ہے ۔ محدث ابن خزیمہ کا قول ہے کہ دنیا میں میں کسی کو ان سے بڑھ کر عالم نہیں جانتا ۔"

" بعض محدثین (سلیمان) نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ یہ شیعوں کیلئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے ۔ لیکن علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے : ھذا رجم بالظن الکاذب بل ابن جریر من کبار ائمۃ الاسلام المعتمدین ۔

علامہ ذہبی نے اس موقع پر لکھا ہے کہ ان میں فی الجملہ تشیع تھا ۔ لیکن مضر نہیں ۔ تمام مستند اور مفصل تاریخیں مثلاً کامل ابن اثیر ۔ ابن خلدون ۔ ابو الفداء وغیرہ ان ہی کی کتاب سے ماخوذ اور اسی کتاب کے مختصرات ہیں ۔ یہ کتاب بھی ناپید تھی اور یورپ کی بدولت شائع ہوئی ۔" (کتاب مذکور ص ۲۷)

علامہ شبلی کا اقتباس کسی قدر طویل ہے ۔ لیکن اس میں ابن جریر کے بارے میں مختلف آراء کا خلاصہ آگیا ہے ۔ گویا اس کی طوالت ہمارے لئے اختصار کا باعث ہے ۔

مولانا عبدالحق حقانی دہلوی نے تفسیر حقانی کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ :

"ایک ابن جریر شیعہ اور کرامیہ بھی ہیں۔ اس سے ناواقفوں کو اشتباہ ہو جاتا ہے۔"

(کتاب مذکور حاشیہ پر صفحہ ۱۴۹)

حضرت دہلوی کے اس بیان سے ابن خلکان کے اس قول کی تائید اور تشریح بھی ہو جاتی ہے۔ جس میں موصوف نے فرمایا ہے :

"رأیتُ بمصر قبراً یزار وعند رأسہ حجرٌ علیہ مکتوب ھٰذا قبر ابن جریر الطبری والناس یقولون ھٰذا صاحب التاریخ ولیس بصحیح بل الصحیح انہٗ ببغداد۔" (وفیات الاعیان الجز الاول صفحہ ۴۵۶)

غرض ابن جریر کے افکار و نظریات کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی مختلف وجوہ ہیں۔

۱۔ بغداد کے حنابلہ کی مخالفت۔

۲۔ شیعوں کی تائید میں روایات کا بیان کرنا۔

۳۔ نام اور کنیت کا اشتباہ۔

واقعہ یہ ہے کہ ابن جریر نے فقہاء کے بیان میں امام احمد بن حنبل کا ذکر نہیں کیا۔ اور بغداد کے حنبلیوں نے جب وجہ پوچھی تو فرمایا احمد بن حنبل فقہ کے امام نہیں بلکہ حدیث کے امام تھے۔ امام موصوف کے مقلدوں کو یہ رائے ناگوار معلوم ہوئی اور اس میں امام احمد بن حنبل کی توہین نظر آئی۔ چنانچہ یہ لوگ آپ کے مخالف ہو گئے اور مخالفت بایں جا رسید کہ ۳۱۰ھ میں جب ابن جریر بغداد میں فوت ہوئے تو حنبلیوں نے جن کی بغداد میں اکثریت تھی مرحوم کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ ہونے دیا۔ اور مجبور ہو کر مرحوم کے تلامذہ اور معتقدوں نے آپ کو گھر ہی میں دفن کیا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کے بارے میں مخالفت کا یہ عالم ہو کہ اس کے متعلق غلط خبروں اور افواہوں کا پھیل جانا بعید از قیاس نہیں۔

تاریخ طبری اور تفسیر طبری میں بکثرت روایات نقل کی گئی ہیں ابن جریر نے محدثین کے قاعدے کے مطابق روایات کے نقل کرنے میں احتیاط نہیں کی۔ کسی خاص واقعہ کے بارے میں جو بھی روایات ملیں سب کی سب نقل فرما دیں اور خطا و صواب یا غلط اور صحیح کا فیصلہ نہیں کیا۔ اس طرح شیعہ فرقہ کے مخصوص عقائد و نظریات کی تائید میں بھی روایات کا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ جب شیعہ حضرات نے اپنی تائید میں یہ روایات پیش کیں، تو مخالفین نے

تاقل روایات ابن جریر کی تنقیص شروع کر دی۔ اسکی تفصیل مقالے کے دوسرے حصے "تاریخ ابن جریر" میں آئے گی۔ انشاءاللہ۔

یہ حقیقت ہے کہ ابن جریر نام کے متعدد اہل قلم گذرے ہیں۔ ان میں سے بعض شیعہ بھی تھے۔ اس سے جیسا کہ مصنف دہلوی نے فرمایا ہے۔ ناواقفوں کو دھوکا ہوا ہے اور امام ابن جریر کے بارے میں غلط باتیں مشہور ہو گئی ہیں۔ نیز تذکرہ نگاروں نے بھی زیب داستان کیلئے کچھ باتیں لکھ دی ہیں۔ کشف الظنون کے حوالے سے اوپر جو بات تاریخ کی طوالت کے بارے میں نقل کی ہے۔ یہی بات تفسیر کے بارے میں بھی مشہور ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایک ہی قسم کی گفتگو دو مختلف کتابوں کے بارے میں گو ممکن ہے لیکن متوقع نہیں۔ (کشف الظنون کے صفحہ ۲۹۷ پر یہ واقعہ تاریخ کے بارے میں درج ہے۔ اور صفحہ ۴۳۷ پر تفسیر کے بارے میں مذکور ہے۔)

ہمارا خیال ہے کہ ابن جریر کے بارے میں صاحب میزان الاعتدال فی نقد الرجال کا یہ قول صحیح ہے:

فیه تشیعٌ وموالاة لا تضر (ابن جریر میں کسی حد تک شیعہ رجحان ہے، لیکن یہ رجحان مضر نہیں۔) اور احمد بن علی السلیمانی الحافظ کا قول: کان یضع للروافض (وہ شیعوں کے لئے جھوٹی روائتیں گھڑا کرتے تھے۔) یوں صحیح ہے — کان ینقل للروافض (وہ شیعوں کے لئے روائتیں نقل کر دیتے تھے۔) واللہ اعلم بالصواب۔

نوٹ:- مقالے کا دوسرا حصہ "تاریخ ابن جریر" ہے۔ جو آئندہ قارئین کی نذر کیا جائے گا۔ انشاءاللہ۔

- اہل کرم وہ ہے جو غیر کی حاجت کو اپنی حاجت پر مقدم رکھے۔ — مجدد الف ثانیؒ
- نیک بات دوستوں کو پہنچا دے اور مخالفوں سے بحث مت کر۔ — "
- اہل خیر این کی پریشان کن باتوں سے رنجیدہ خاطر نہ ہو بلکہ سن ہی مت۔ — "
- مومن مدیافت کرنے والا ہے اور منافق فوراً گرفت کرنے والا۔ — "
- شریعت دنیا و آخرت کی سعادتوں کی ضامن ہے۔ — "
- اعلیٰ نصیحت یہ ہے کہ پیروی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اختیار کرو۔ — "

ادبیات

الامام المجدّد السرہندیؒ

مولانا غلام نبی فاروقی شرقپور ضلع شیخوپورہ

حمداً لمن یُعطی الانام نوالا — علما وحکما للعقول عقالا

ثم الصلوٰۃ علی النبی وآلہ — وعلی الصحابۃ کلہم تتوالی

لِلّٰہ فی عرض البسیطۃ الفئۃ — مقبولۃ عند الالٰہ تعالیٰ

ہم وارثون عن الرسول لدینہ — ہم ناقلون لدینہ اَجیالا

واتوا الدیانۃ کابراً عن کابرٍ — کانوا رجالا للعلوم جبالا

منہم مجدد الف ثانی اذا اتیٰ — قطب الولایۃ عارفا فضالا

ہو جامع لشریعۃ بطریقۃ — بحر الہدیٰ یَسقی العطاش زلالا

کانت بارض الہند عند ظہورہٖ — فتن تجر الی القلوب ضلالا

قد اشربت فی الناس الفۃ بدعۃ — لم یترکوہا غافلین مآلا

خلط الرعایا فی التناکح بینہم — بالمسلمین مع الہنود عیالا

نُصب الکنائس فی جوار مساجد — خلطوا الشمائل ضیّعوا اَعمالا

ضیعت شریعۃ ربنا اصولہا — وفروعہا حَتّی اخیفَ زوالا

بدعات اکبر شہ جلال الدین فی — دین الٰہی سَمِعتَ ثقالا

عمّ الفساد وقد مضیٰ لسبیلہ — نال الحکومۃ ابنہ ومثالا

فالشیخ خالف کل فعل معاند — ضد الشریعۃ زوّجوہ خبالا

بدیانۃ وامَانۃ ومتانۃ — وفطانۃٍ ورزانۃ اکمالا

بسیاسَۃٍ شرعیۃ نبویۃ — حَنَفیۃٍ دینیۃٍ اعمالا

لجبلّۃ الفاروق شیمۃُ شیخنا — یمحو المفاسد کلہا ابطالا

لم یکترث بجفاء اہل حکومۃٍ — آخَذُوہ فی تلک البلاد جدالا

فاعاد من حکم الشریعة ما عفا — واباد کل الرسم استیصالا
حتی رای جهانگیر خیر مقامه — فاراد استخلاصه اجلالا
فابی الی ان اصلح المطوح من — دین الرسول وحاز فیه جمالا
اما الملوک فسوف یسلب ملکهم — فالحکم للرحمن جل جلالا
فجزاه رب الناس خیر جزائه — ذو الفضل والنعم الجسام مجزالا
والبوتراب قال رب اغفر لنا — آثامنا اجرامنا اثقالا
انت الکریم ولا تخیب سائلاً — وسوالک یعقبن العطا ونوالا

انتخاب از جناب محمد اقبال تبلیغی حارث آبادی

قسط ـــ ۴

امام ربّانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے علوم و معارف

بروایت حکیم الامت مولانا تھانویؒ

۵۸۔ فرمایا: حضرت مولانا گنگوہیؒ ایک مرتبہ بیمار ہو گئے جب تندرست ہوئے تو صاحبزادے نے شکریہ میں بہت لوگوں کی دعوت کی۔ مولاناؒ نے اپنے ایک خاص خادم سے فرمایا کہ جب غریب لوگ کھانا کھا چکیں تو ان کے سامنے کا بچا ہوا کھانا جو کہ سقوں کو دیا جاتا ہے وہ سب میرے پاس لے آنا کہ وہ تبرک کھاؤں گا۔ اور یہ خیال نہ کرنا کہ ان کا بدن صاف نہیں، ان کے کپڑے صاف نہیں۔ اور اس کو تبرک اس لئے قرار دیا کہ وہ لوگ مومن ہیں۔ خدا کے محبوب ہیں، حدیث میں آیا ہے۔ یَا عَائِشَۃُ قَرِّبِی الْمَسَاکِیْنَ۔ چنانچہ وہ کھانا حضرت کے پاس لایا گیا اور حضرتؒ نے اسے رغبت سے کھایا تو کیا کسی نے ایسی قدر غریبوں کی کر کے دکھائی ہے۔ (تجارتِ آخرت ص۱۴)

اس سے حضرت گنگوہیؒ کی اتباع سنت اور تواضع ظاہر ہے۔

۵۹۔ فرمایا: حضرت مولانا گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ آجکل کے پیروں کی یہ حالت ہے۔ کہ اگر کوئی دیہاتی ان کے سامنے سر کھجانے لگے تو پیر صاحب کو خیال ہوتا ہے۔ کہ شاید پگڑی میں سے روپیہ نکال کر دے گا۔ واقعی بالکل سچ ہے۔ حرص و طمع نے ہماری وہی حالت بنا دی۔ (تجارتِ آخرت ص۱۶ ذکر الرسولؐ ص۱۳)

۶۰۔ فرمایا: حضرت مولانا گنگوہیؒ جو اس قدر مضبوط اور قوی القلب تھے کہ بڑے سے بڑے فتنے اور فساد کے وقت بھی مستقل رہتے۔ اور از جا رفتہ نہ ہوتے تھے۔ اس کا راز یہی تھا کہ وہ صرف ایک ذات کی رضا پر نظر رکھتے تھے۔ ثمرات پر نظر نہ رکھتے تھے۔ ایک زمانہ میں مدرسہ دیوبند کے خلاف دیوبند میں بڑی شورش تھی، اور اہل قصبہ کا مطالبہ وہی تھا جو آجکل ہو رہا ہے کہ ایک ممبر ہماری مرضی کے موافق ممبران مدرسہ میں بڑھا دیا جائے۔ مولانا گنگوہیؒ اس کو منظور نہ

فرماتے تھے۔ یہ فتنہ اس قدر بڑھا کہ اس زمانہ میں جو میرا دیوبند جانا ہوا تو مجھے مدرسہ کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہوا۔ میں نے حضرتؒ کو ایک خط لکھا کہ اگر اس وقت شہر والوں کا مطالبہ مان لیا جائے تو مدرسہ کا کچھ نقصان نہ ہوگا۔ کیونکہ مجلس شوریٰ میں کثرت آپ کے خدام کی ہے۔ اور کثرت رائے سے ہی فیصلہ ہوا کرتا ہے۔ ان کے ایک ممبر کی رائے سے فیصلہ پر کچھ اثر نہیں ہو سکتا اور مطالبہ نہ ماننے میں مجھے مدرسہ کے بند ہو جانے کا اندیشہ ہے تو حضرتؒ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ ہم کو مدرسہ مقصود نہیں، رضائے حق مقصود ہے۔ اور نا اہل کو ممبر بنانا معصیت ہے جو خلاف رضائے حق ہے۔ اس لئے ہم اپنے اختیار سے ایسا نہیں کریں گے۔ کیونکہ اس پہ ہم سے مواخذہ ہوگا۔ اگر اہل شہر کے فتنہ سے مدرسہ بند ہو گیا تو اس کے جواب دہ وہ قیامت میں خود ہوں گے کیونکہ ان کے ہی فعل کا یہ نتیجہ ہوگا ہم سے اس کا مواخذہ نہ ہوگا۔ الحمدللہ جو بات مجاہدوں سے برسوں میں بھی حاصل نہ ہوئی وہ بزرگوں کی جوتیوں کے طفیل ایک ساعت میں حاصل ہو گئی۔ حضرتؒ نے اس تحریر میں جس علم کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ وہ بہت بڑا علم ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ ثمرات مقصود نہیں صرف رضائے حق مقصود ہے۔ نہ مدرسہ مقصود ہے نہ طلبہ کی کثرت مطلوب ہے۔ نہ عمارت مقصود ہے۔ صرف رضا مقصود ہے۔ اگر رضائے حق کے ساتھ یہ کام چلتے رہیں تو چلاؤ اور حسب ہمت و طاقت ان میں کام کرتے رہو۔ اور جو کام طاقت سے زیادہ ہو اس کو الگ کرو۔ واللہ اس علم سے بہت سے پریشان حالوں کی پریشانیاں اور وساوس قطع ہو گئی ہیں۔ اس علم سے اعمال میں کام لے کر دیکھو تو اسکی قدر ہوگی۔ (ارضاء الحق حصہ دوم صفحہ ۵، صفحہ ۵۱)

۱۸۔ فرمایا، کہ صورت ریا ریا نہیں ہے۔ اسی کی ایک فرع یہ بھی ہے کہ وسوسہ ریا ریا نہیں ہے۔ بس ریا وہ ہے کہ عمل دینی سے مقصود وہی غیر حق ہو اور غیر حق کو ارضاء حق کا واسطہ بھی نہ بنایا گیا ہو اور اگر مقصود عمل سے غیر حق ہو تو غیر کا وسوسہ آنا مضر نہیں رہا۔ رہا یہ کہ اسکا معیار کیا ہے جس سے معلوم ہو کہ وسوسہ ریا تھا۔ نہ کہ حقیقت ریا تو ائمہ طریق نے اسکو بھی بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ریا یہ ہے کہ اس کے دیکھنے والے چلے جائیں تو یہ ذکر وغیرہ کو قطع کر دے اور اگر ان کے جانے کے بعد ذکر کو قطع نہ کرے تو دیکھنے والوں کے ہوتے ہوتے جو ان کی طرف خیال کیا تھا۔ یہ وسوسہ ریا تھا، ریا نہ تھا۔ خوب سمجھ لو بعض لوگ اس حقیقت کے نہ جاننے سے پس و پیش کرتے ہیں کہ اس میں تو ریا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ایک شخص کو ذکر جہر تعلیم فرمایا تو اس نے یہی کہا کہ اس میں تو ریا ہو گی خفی کر لیا کروں۔ مولاناؒ نے فرمایا جی ہاں اس میں تو ریا ہو گی اور

خفی میں نہ ہوگی۔ ارے بیٹھو ذکر خفی میں تو اس سے زیادہ ریا ہوگی۔ کیونکہ ذکر جہر میں تو لوگ یہی جانیں گے کہ بس اِلَّا اللہ اِلَّا اللہ کر رہے ہیں۔ اور جب گردن جھکا کر بیٹھو گے تو لوگ سمجھیں گے کہ نہ معلوم کہاں کہاں کی سیر کر رہا ہے۔ عرش کی یا کرسی کی۔ چاہے میاں سوتے ہی رہیں۔ چنانچہ مولاناؒ نے فرمایا کہ جس زمانہ میں ہم تھانہ بھون حاجی صاحبؒ کی خدمت میں تھے۔ اس وقت ایک نقشبندی بزرگ بھی آئے ہوئے تھے۔ رات کو ہم ذکر جہر کرتے تھے اور وہ ذکر خفی، مگر صبح کو وہ شکایت کرتے تھے کہ آدھا ذکر ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد نیند آگئی تھی اور میں سر جھکائے سو رہا۔ اور ہم سب اپنا معمول پورا کر لیتے تھے۔ تو حضرت ذکر خفی میں بعض دفعہ آپ سوتے ہی رہیں گے۔ اور لوگ سمجھیں گے کہ شیخ صاحب مراقب ہیں۔ تو یہ اچھا انسداد ریا ہوا کہ ذکر ہی سے رہ گئے۔ بس یہ وسوسہ لغو ہے۔

(ارضاءالحق حصہ دوم ص۶۷ ذم ھوئی ص۱۹)

۹۲۔ فرمایا: حضرت مولانا گنگوہیؒ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے ہاں ایک بڑے عہدہ دار کوئی شخص مہمان آئے۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو حضرتؒ نے اپنے ساتھ ان کو بٹھلایا کیونکہ وہ بڑے آدمی سمجھے جاتے تھے ان کو ساتھ بیٹھا دیکھ کر دوسرے غریب طلبہ مہمان پیچھے ہٹے۔ حضرت مولاناؒ نے فرمایا صاحبو! آپ لوگ کیوں ہٹ گئے، کیا اس وجہ سے کہ ایک عہدہ دار میرے ساتھ بیٹھا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ آپ لوگ میرے عزیز ہیں۔ میں جس قدر آپ کو معزز سمجھتا ہوں۔ اس کے سامنے ان کی کچھ بھی وقعت نہیں۔ چنانچہ سب غریب طلباء کو بھی ساتھ بٹھلا کر ساتھ کھلایا۔ شاید اس سے کسی کو یہ شبہ ہو کہ مولاناؒ نے اپنی شان جتلانے کو ایسا کہہ دیا ہوگا۔ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ وہاں شان اور بڑائی کا نام بھی نہ تھا۔ جن صاحبوں نے مولاناؒ کو دیکھا ہے وہ تو خوب جانتے ہیں۔ مگر جن لوگوں نے نہیں دیکھا ہے۔ ان کیلئے ایک قصہ بیان کرتا ہوں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ وہاں شان اور بڑائی کتنی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت مولاناؒ حدیث شریف کا درس دے رہے تھے۔ ابر ہو رہا تھا کہ اچانک بوندیں پڑنا شروع ہوئیں۔ جس قدر طالب علم شریک درس تھے۔ سب کتاب کی حفاظت کیلئے کتابیں اٹھا کر بھاگے اور سہ دری میں پناہ لی اور کتابیں رکھ کر جوتے اٹھانے چلے، صحن کی طرف جو رخ کیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت مولاناؒ سب کے جوتے سمیٹ کر جمع کر رہے ہیں۔ اس واقعہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہاں کس قدر شان کو جتلایا جاتا تھا۔ شان نہ تھی بلکہ محض محبت دینی تھی کہ غرباء کو امراء سے کچھ کم نہیں سمجھا۔ یہی لوگ ہیں جن کی بدولت دنیا کا کارخانہ قائم اور نظام عالم مسلسل ہے۔ جس دن یہ حضرات نہ رہیں گے، قیامت قائم ہو جائے

گی۔ (اکمال الصوم والعید ص ۲۴)

۶۳۔ فرمایا: میں نے حضرت مولانا گنگوہیؒ سے مرزا صاحبؒ (حضرت مرزا جانجاناں مظہرؒ) کی حکایت سنی ہے کہ تھانہ بھون کے ایک رئیس حضرت (مرزا صاحبؒ) کی خدمت میں زیارت کیلئے حاضر ہوئے ان کے ایک مصاحب بھی تھے جو کسی ضرورت سے اٹھ کر گئے اور ادھر پشت ہوئی۔ مرزا صاحبؒ نے اس وقت ان کے پاجامہ کے نیفے میں سلوٹیں بے ڈھنگی طرح پڑی ہوئی دیکھیں۔ مرزا صاحبؒ نے ان رئیس سے فرمایا تمہارا ان کے ساتھ کیسے گزر ہوتا ہے جن کو پاجامہ پہننا بھی نہیں آتا۔ دیکھو تو نیفے میں سلوٹیں کس طرح پڑی ہوئی ہیں کہ ایک طرف کم ایک طرف زیادہ۔

اس سے حضرت مرزا صاحبؒ کی لطافت مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔

۶۴۔ فرمایا: کہ مکہ معظمہ میں حضرت مولانا گنگوہیؒ سے حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ فلاں جگہ مولود شریف ہے، چلتے ہو۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے صاف انکار کر دیا، نہیں حضرت میں نہیں جا سکتا۔ کیونکہ میں ہندوستان میں اسکو منع کیا کرتا ہوں لوگ سند پکڑیں گے۔ حضرت حاجی صاحبؒ کی شان دیکھئے، فرمایا جزاک اللہ میں تمہارے جانے سے اتنا خوش نہ ہوتا جتنا کہ نہ جانے سے خوش ہوا۔ اور اگر کوئی پیر ہوتا تو سمجھتا کہ مریدی سے خارج ہو گئے اس سے حضرت حاجی صاحبؒ کا مذاق معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ مولود میں نہ جانے کو پسند فرمایا۔ پھر خود تشریف لے گئے اس قول اور فعل سے دونوں فریق اپنا اپنا مدعا ثابت کر سکتے ہیں۔ حضرتؒ کا عجب رنگ تھا۔ تصوف غالب تھا۔ فرمایا کرتے تھے۔ ہر شخص مجھ کو اپنا رنگ سمجھتا ہے حالانکہ میرا کوئی رنگ نہیں۔ (حسن العزیز ص ۱۴۲)

۶۵۔ فرمایا: کہ انبیٹھہ کے ایک صاحب منشی تجمل حسین حضرت حاجی صاحبؒ سے بیعت تھے۔ ان کی عادت تھی کہ درویشوں سے بہت ملتے تھے۔ ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے۔ انکی بی بی نے ایک دفعہ حضرت مولانا گنگوہیؒ سے شکایت کی۔ مولاناؒ نے فرمایا کیوں ادھر ادھر پھرتے ہو۔ عرض کیا کہ اس میں شک نہیں کہ ہمارے حضرات کے برابر کوئی کامل نہیں۔ اللہ کے فضل سے سب کچھ موجود ہے لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ میرا قلب جاری ہو جائے۔ اسکی فکر میں ادھر ادھر پھرتا ہوں۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ اس میں کیا رکھا ہے۔ عرض کیا کہ یہ میں خوب جانتا ہوں کہ اس میں واقعی کچھ نہیں رکھا۔ لیکن میں اسکو کیا کروں کہ جی چاہتا ہے۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ اچھا جاؤ۔ مسجد میں جا بیٹھے ادھر مولاناؒ وضو کر کے کھڑاویں پہن کر مسجد کی طرف چلے۔ کھڑاوں کی کھٹ کھٹ سنی تھی کہ ادھر ان کا قلب جاری ہو گیا۔ دوڑ کر مولاناؒ کے قدم پکڑ لئے کہ الحمد للہ جو میں چاہتا تھا وہ حاصل ہو گیا اب میں کسی سے نہ ملوں گا چنانچہ اس کے بعد انہوں نے ادھر ادھر پھرنا چھوڑ دیا۔ (حسن العزیز ص ۳۹۱)

(باقی آئندہ)

محمد محترم فہیم عثمانی

حضرۃ شاہ فضل علی قریشی رح

الحق ماہ ربیع الاوّل ۱۳۹۱ھ کے شمارے میں حضرت خواجہ فضل علی شاہ قریشی مسکین پوری علیہ الرحمۃ کے ملفوظات مبارکہ نظر نواز ہوئے۔ حضرت کے اسم گرامی پر نظر پڑتے ہی برسوں پہلے کی ایک یاد تازہ ہوگئی۔ زبان پر حضرت کے ملفوظات تھے اور دماغ میں تمام وہ نقوش اجاگر ہو رہے تھے جو وقت کے ظالم ہاتھوں ماند پڑ چکے تھے۔ حضرت خواجہ صاحب راقم الحروف کے والد مرحوم مولانا محمد مسلم عثمانی دیوبندی کے پیر و مرشد تھے اور اسی تعلق سے آج سے تقریباً ۳۵، ۳۶ سال قبل راقم الحروف کو اپنے بچپن کے زمانہ میں حضرت خواجہ صاحب علیہ الرحمۃ سے شرفِ نیاز حاصل ہوا تھا۔ یہ تقریباً ۱۳۵۳ھ یا ۱۳۵۴ھ کا زمانہ تھا جب حضرت خواجہ فضل علی قریشی علیہ الرحمۃ ایک بار راقم الحروف کے وطن مالوف دیوبند تشریف لائے اور والد مرحوم کی درخواست پر کچھ دیر کے لئے ہمارے مکان پر بھی قدم رنجہ فرمایا۔

راقم الحروف کی عمر اس وقت بمشکل پانچ سال کی ہوگی۔ ظاہر ہے اس عمر کا کوئی واقعہ ذہن میں شاذونادر ہی محفوظ رہتا ہے۔ مگر شاید حضرت خواجہ صاحب کی توجہ خاص کا یہ فیض تھا، کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ گو ذہن سے حضرت کی زیارت کی تفصیلات محو ہوتی گئیں مگر حضرت کے اس دستِ مبارک کا لمس جو حضرت نے جوشِ شفقت میں اس عاجز کے سر پہ رکھا تھا عمر کے ہر حصہ میں تازہ رہا۔ آج تک عالم یہ ہے کہ ذرا تصور کرتا ہوں تو حضرت کے انس و محبت سے بھرپور ہاتھ کی نرمی اور گدگداپن ذہن کے نقوش پر ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ راقم الحروف کی والدہ محترمہ بتاتی ہیں کہ تمہاری ان دنوں نئی نئی بسم اللہ ہوئی تھی اور [illegible] صاحب کے پاس تم غالباً عم کا پارہ پڑھنے جاتے تھے۔ حضرت نے اس موقع پر [illegible] میں کچھ دعائیہ کلمات کہے جو

پردہ میں ہونے کے باعث بالفاظہ تو نہیں سنے جا سکے مگر وہ یقیناً ہمارے ذہن اور حافظہ کی تیزی سے متعلق تھے۔ حضرت کی دعا کا یہ اثر تھا کہ چھ مہینے نہ گذرنے پائے تھے کہ راقم الحروف نے ناظرہ قرآن کریم ختم کر لیا۔ حافظ صاحب جتنا سبق دیتے تھے اگلے روز اس سے دوگنا جا کر سنا دیتا تھا۔ حضرت خواجہ صاحب کے ان دعائیہ کلمات ہی کا یقیناً یہ فیض تھا کہ ناظرہ قرآن کے بعد محض ڈیڑھ سال کی قلیل مدت میں قرآن شریف حفظ بھی ہو گیا۔ اور اسی طرح حضرت خواجہ فضل علی قریشی رحمۃ اللہ علیہ کی دعا کی برکت سے سات سال کی عمر میں راقم الحروف قرآن کریم کا حافظ بن گیا۔ اب تک بھی الحمد للہ حضرت کی دعا کا اثر پاتا ہوں۔ حافظہ کی قوت الحمد للہ اب بھی اتنی قائم ہے کہ مشکل سے مشکل عبارت اگر زبانی یاد کرنا چاہوں تو اپنی جانی پہچانی زبانوں میں سے خواہ کسی زبان میں بھی ہو آسانی طویل سے طویل عبارات یاد کر لیتا ہوں۔

حضرت خواجہ صاحب کی دیوبند تشریف آوری کس سلسلہ میں ہوئی تھی۔ یہ تو نہ مجھے یاد ہے۔ اور نہ کسی دیگر ذریعہ سے ہی معلوم ہو سکا ہے۔ البتہ والدہ فرماتی ہیں کہ ان دنوں کچھ عرصہ پہلے حضرۃ مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا تھا، ان کے مزار مبارک پہ حاضری کی غرض سے شاید حضرت خواجہ صاحب دیوبند تشریف لائے تھے۔ قیام بہت مختصر وقفہ کیلئے تھا۔ صبح کے ناشتہ پہ والد صاحب کی درخواست پر ہمارے مکان پر تشریف لائے۔ حضرت کا حلیہ مبارک تو ذہن میں محفوظ نہیں رہا۔ البتہ اتنا یاد پڑتا ہے کہ حضرت تہمد باندھے ہوئے تھے۔ والدہ فرماتی ہیں۔ کہ حضرت کے تقویٰ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ کہ ناشتہ میں کوئی بھی ترچیز ایسی نہ ہو جو کسی ہندو یا غیر مسلم کے یہاں سے آئی ہوئی ہو۔ حتیٰ کہ گھی تک بھی بطور خاص ایک مسلمان پڑوسی کے گھر سے منگایا گیا جسکی اپنی بھینس تھی۔ کیونکہ دیوبند کی دکانوں پہ جو گھی آتا تھا وہ عموماً گاؤں کے لوگ شہر میں لا کر فروخت کرتے تھے اور ایسے گھی کے بارے میں اس بات کا تعین مشکل تھا کہ وہ مسلمان کے گھر کا ہے یا ہندو کے گھر کا۔ ناشتہ میں دیگر اشیاء کے علاوہ آم کا سادہ اچار بھی تھا۔ دیوبند میں یہ طریقہ عام تھا کہ رس بھرے آم کو نچوڑ کر اس میں نمک مرچ ملا لیتے تھے، اور روٹی لگا کر کھاتے تھے۔

حضرت دیگر تمام اشیاء کو چھوڑ کر اسی اچار سے روٹی تناول فرماتے رہے۔ والد مرحوم نے عرض کیا کہ حضرت ناشتہ میں جتنی اشیاء ہیں ان میں سے کوئی بھی شے ایسی نہیں ہے جو ہندو کے یہاں سے خریدی گئی ہو یا جس میں بطور خاص اس لحاظ سے تقویٰ کا خیال نہ رکھا گیا ہو

حضرت نے فرمایا یہ درست ہے مگر اس سادہ اچار کے کھانے سے تقویٰ موٹا ہوتا ہے۔ اور ان دیگر اشیاء کے کھانے سے نفس موٹا ہوتا ہے۔ بتاؤ تمہیں کس کا موٹا ہونا مطلوب ہے۔ غرض حضرت خواجہ صاحب نے پورا ناشتہ اسی سادہ اچار سے ہی تناول فرمایا۔ والد صاحب نے بعد میں گھر والوں کو بتایا کہ اسی طرح حضرت نے لائل پور میں ایک دعوت میں ساری روٹی محض پانی سے تناول فرمائی۔ ہوا یوں کہ ایک مرتبہ حضرت خواجہ صاحب لائل پور تشریف لائے والد مرحوم کے پاس قیام فرمایا۔ والد صاحب مدرسہ اشاعت العلوم میں درس و تدریس کی ذمہ داری کے سلسلہ میں کوئی بیس بائیس سال لائل پور میں رہے ہیں۔ غرض حضرت خواجہ صاحب لائل پور تشریف لائے تو والد صاحب کے پاس ٹھہرے۔ ایک مرید نے دعوت کردی۔ حضرت نے قبول تو فرمائی مگر دعوت میں سالن اور پلاؤ وغیرہ میں سے کسی بھی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ ساری روٹی محض پانی کے ساتھ تناول فرمائی۔

والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ دراصل حضرت خواجہ صاحب کو اکل حلال اور طیب غذا کا حد درجہ اہتمام تھا۔ اسی بناء پر غذا کے معاملہ میں حضرت اس قدر محتاط تھے کہ پھلوں کے سوا بازار کی کوئی چیز تناول نہ فرماتے تھے اور نہ ہی کوئی ایسی شے کھاتے جس میں بازار کا گھی ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر تبلیغی سفر میں حضرت خواجہ صاحب اپنے ساتھ کھانا پکانے کا سامان بھی رکھتے اور گھر سے گھی مسالہ وغیرہ تک لیکر چلتے۔

حضرت خواجہ صاحب کی اس عادتِ احتیاط کے سلسلہ میں والد صاحب نے ایک مرتبہ نقل فرمایا کہ حضرت خواجہ صاحب ایک روز اکل حلال اور طیب غذا کا ذکر کر رہے تھے۔ دوران ذکر فرمانے لگے کہ میں زمانہ سلوک میں گھر سے دو روٹیاں پکوا کر حضرت قبلہ عالم خواجہ سراج الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جاتا اور تمام راستے اسی پہ گذارہ کرتا، مگر مشکوک غذا نہ کھاتا اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میں ایک دن قبلۂ عالم کی خدمت میں جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک رات ایسی بستی میں ٹھہرا کہ وہاں صبح کے وقت کسی رئیس کے گھر ولیمہ کی عام دعوت تھی صبح ہوتے ہی دعوت کا چرچہ عام ہوگیا اور لوگ اطراف و اکناف سے دعوت کھانے کیلئے آنے لگے۔ لیکن میرے پاس بھنے ہوئے چنے تھے میں نے ان کو کھا کر پانی پیا اور شکرانۂ الٰہی بجا لاکر شیخ کی طرف چل پڑا راستہ میں لوگ مجھے دعوت کیلئے روکتے اور اس کے چھوڑنے پر مجھے دیوانہ سمجھتے تھے مگر میں غذا محتاط نہ ہونے کی وجہ سے اس کا کھانا تقویٰ کے خلاف سمجھتا تھا۔

دراصل حضرت خواجہ صاحب کو نفس کشی میں بھی درجۂ کمال حاصل تھا۔ غذا کے معاملہ میں اسقدر محتاط ہونے میں حضرت کے اس اہتمام نفس کشی کو بھی دخل تھا۔ والد صاحب نے اپنی تالیف "حیات فضلیہ" میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ صاحب وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ کی سچی تصویر تھے۔ آپکا لباس طعام رفتار گفتار غرض ایک ایک چیز آپ کی اس حالت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ آپ کا عالم یہ تھا کہ آپ روزمرّہ ضروریات کیلئے بھی اپنے گھر والوں تک سے کبھی کسی احتیاج کا اظہار نہ فرماتے حتیٰ کہ کھانا تک بھی اگر گھر والوں میں سے کسی کو خیال آگیا اور اس نے کھانا سامنے لاکر رکھ دیا تو کھالیا ورنہ کئی کئی وقت [illegible] کے رہتے اور کسی سے حاجت ظاہر نہ فرماتے ایسے واقعات مسکین پور شریف کے سالانہ اجتماعات کے موقعہ پر اکثر پیش آیا کرتے ایسے مواقع پر خلق خدا کا ہجوم ہوتا تھا۔ لوگ پیچھا نہ چھوڑتے اور اپنی ضرورتیں بیان کرتے رہتے۔ ہر ایک کو حضرت صاحب خندہ پیشانی سے جواب دیتے رہتے۔ بسا اوقات دیر تک بیٹھے رہنے کی وجہ سے کمزور اور نڈھال ہو جاتے۔ بھوک کی تاب گرنے کے قریب ہو جاتے مگر زبان سے ذکر تک نہ فرماتے۔ حضرت خواجہ صاحب کی عادت تھی کہ مہمانوں کو کھلائے بغیر کبھی کھانا نہ کھاتے۔ اکثر صبح کو ایک بجے اور رات کو گیارہ بجے مہمانوں کا کھانا تیار ہوتا۔ اس قدر پیرانہ سالی کے باوجود آپ انتظار فرماتے۔ مہمانوں کی خدمت گذاری میں اس قدر شغف تھا کہ ابتدائی زمانہ میں حضرت اپنے ہاتھ سے چکی میں آٹا پیس کر مہمانوں کے لئے لاتے۔ زوجہ محترمہ روٹیاں پکاتیں اور حضرت اپنے سر پہ رکھ کر لاتے۔ اپنی زمین کی پیداوار سے لنگر چلاتے اور فرمایا کرتے کہ ہم تو درویشوں کے نوکر ہیں۔ مزدوری کرتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ سردی کے زمانے میں گھر میں مہمانوں کی کثرت ہوتی زوجۂ محترمہ مشغولیت کی وجہ سے بستر کرنا بھول جاتیں تو آپ ایسے ہی ننگی چارپائی پہ لیٹ جاتے اور کسی ناگواری کا اظہار نہ فرماتے۔ غرض کھانا کھانے کی بات ہو یا سونے کا معاملہ، نفس ہر حالت میں حضرت خواجہ صاحب کے تابع تھا۔

معلوم ہوتا ہے حضرت خواجہ صاحب قلت کلام اور قلت طعام پر بھی شدت سے عمل پیرا تھے۔ والدہ صاحبہ فرماتی ہیں کہ ناشتہ میں حضرت نے مشکل سے چند لقمے ہی تناول فرمائے ہوں گے۔ اسی طرح جتنی دیر حضرت ہمارے مکان پر تشریف فرما رہے بہت کم کلام فرمایا۔ قلت منام بھی یقیناً آپ کے معمولات میں شامل ہوگی مگر چونکہ حضرت کا قیام صرف چند گھنٹے ہی رہا اس لئے ہمارے گھر والوں میں سے کسی کو اس کا مشاہدہ نہ ہو سکا، والد صاحب سے البتہ سنا کہ حضرت صاحب

فرمایا کرتے تھے کہ تصوف کیلئے چار چیزیں ضروری ہیں۔ قلۃ الکلام، قلۃ المنام، قلۃ الطعام، قلۃ الاختلاط مع الانام۔

دیوبند میں اسی قیام کے دوران حضرت خواجہ صاحبؒ نے حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے مزارات پر مراقبہ بھی فرمایا پھر ایک مجلس میں حضرت نے ان دونوں حضرات کا حیات کے زمانہ کا حلیہ بیان فرمایا جو حرف بحرف درست تھا حالانکہ حضرت خواجہ صاحب کو ان حضرات سے ملنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا، اور مولانا قاسم نانوتویؒ کے وصال کو تو پچاس پچپن برس گذر چکے تھے جن بڑے بوڑھوں نے حضرت نانوتویؒ کو دیکھا تھا۔ انہوں نے تصدیق کی کہ حضرت خواجہ صاحب نے جو کچھ بتایا حضرت نانوتویؒ کا حلیہ شریف بعینہ ایسا ہی تھا۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے مزار پر مراقبہ کے بعد والد صاحب فرماتے تھے کہ حضرت خواجہ صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ شخص (یعنی والد صاحب) آپ کے خلفاء میں سے ہوگا۔ اس کو ہدایت کرو کہ یہ ہمارے پاس آیا کرے، والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں اس وقت بالکل مبتدی تھا اور بیعت کو تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ مگر شاہ صاحب کی بشارت پوری ہوئی، اللہ نے میری مدد فرمائی تاآنکہ خلافت اجازت سے سرفرازی نصیب ہوئی۔

اسی قیام دیوبند کے دوران حضرت خواجہ صاحب کی اکابر علمائے دیوبند سے بھی ملاقات ہوئی۔ مولانا قاسم نانوتویؒ اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے مزارات پر مراقبہ کے وقت بھی بعض بزرگ موجود تھے۔ حضرت خواجہ صاحب کے چلے جانے کے بعد ان اکابر کو بعض مجالس میں جس بات کا خاص طور سے ذکر کرتے ہوئے سنا گیا وہ یہ تھی کہ حضرت خواجہ صاحب اتباع سنت کا کامل نمونہ نظر آتے ہیں۔ نیز یہ کہ انکساری اور مسکینی اپنے کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے چونکہ حضرت خواجہ صاحب کبھی دیوبند تشریف نہیں لائے تھے، اس لئے ہمارے خاندان کے لوگ حضرت سے واقف نہ تھے۔ چنانچہ والد صاحب نے جب حضرت کے ہاتھ پر بیعت کی تو ہمارے خاندان والے بڑے مضطرب تھے کہ نہ جانے والد صاحب پنجاب کے کس فقیر کے ہاتھ پر بیعت کر آئے ہیں۔ ان کے اس اضطراب کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سلوک کی ابتداء میں والد صاحب پر دنیا سے بے رغبتی اور تنہائی و یکسوئی کی طلب کا بہت غلبہ تھا، فطری طور پر رشتہ داروں کو فکر تھی کہ نہ جانے کس فقیر نے کیا جادو کر دیا ہے۔ اب جو حضرت سے بالمشافہ زیارت نصیب ہوئی اور حضرت کے ارشادات سے مستفیض ہونے کا موقعہ ملا تو سب خاندان والوں کی آنکھیں کھل

گئیں، اب ہر ایک حضرت کے کمالات کا معترف نظر آتا تھا۔ اور والد صاحب کے انتخاب کی داد دیتا تھا۔

والد صاحب فرماتے تھے کہ گو حضرت خواجہ صاحب فقہی اختلافات میں کبھی نہیں الجھتے تھے۔ لیکن دیوبندی مکتب فکر پر اپنے اعتماد کا اظہار حضرت نے کئی مرتبہ بڑی صراحت کے ساتھ فرمایا۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے یہاں تک غور کیا ہے دیوبند والے حق پر ہیں۔ حاسدوں نے جھوٹے الزام لگا کر ان کو بدنام کر رکھا ہے۔ ایک مرتبہ تو سالانہ اجتماع کے موقعہ پر تمام خلفاء کو اکٹھا کر کے فرمایا کہ میں تمہیں بتلا دینا چاہتا ہوں کہ میں نہ دیوبندیوں کا شاگرد ہوں نہ مرید۔ مگر تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میرے وہی عقیدے ہیں جو دیوبندیوں کے ہیں۔ اہل دیوبند حق پر ہیں اور تم مجھے اس معاملہ میں دیوبندی سمجھو۔ فرمایا کہ ہر کام میں توسط اور میانہ روی اچھی چیز ہے۔ خیر الامور اوسطہا۔

حضرت خواجہ صاحب علیہ الرحمۃ کا یہ دورۂ دیوبند پہلا اور آخری دورہ تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی غالباً شعبان ۱۳۵۵ھ میں آپ کا وصال ہو گیا۔ مزار مبارک مسکین پور شریف میں ہی ہے۔ راقم الحروف کو پاکستان بننے کے بعد ایک بار سالانہ اجتماع کے موقعہ پر مزار مبارک پر حاضری کا موقعہ ملا ہے۔ میلوں دور سے ہی فیوض و برکات کے آثار محسوس ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ لحد مبارک کچی ہے، اور گرد ایک کمرہ تعمیر کر دیا گیا ہے۔ مزار مبارک کے اندر داخل ہونے کے بعد سکون و اطمینان قلب کی جو کیفیت طاری ہوتی ہے، اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مزار مبارک کی تعمیر میں کسی قسم کے نقش و نگار سے کام نہیں لیا گیا۔ جس طرح حضرت کی زندگی نہایت سادہ تھی اسی طرح مزار مبارک بھی سادگی کا مجسمہ نظر آتا ہے۔ اور الحمد للہ ہر قسم کی مشرکانہ اور بدعی رسوم سے پاک اور مبرا ہے۔

■■

قارئین کے خطوط
ایڈیٹر کے نام

نیا دور اور علماء الحق دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ پرچہ صوری اور معنوی دونوں لحاظ سے قابل قدر ہے۔ آپ حضرات کی ذمہ داریاں اس دور میں بہت بڑھ گئی ہیں۔ آج سامراجی طاقتیں اور ان کے آلہ کار اسلامی نظریات اور عقائد پر حملہ آور ہیں۔ وہ عالم اسلام کو تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی حیثیت سے مغلوب کرنا چاہتے ہیں۔ آج مسلم ممالک تو کسی حد تک تو سیاسی طور پہ آزاد ہوئے ہیں، لیکن اقتصادی اور تمدنی اعتبار سے روز بروز اغیار کے پنجہ میں پھنستے جا رہے ہیں۔ اس وقت عالم اسلام کا اولین مسئلہ ذہنی و فکری آزادی حاصل کرنا ہے۔ اس دور میں اتباع شریعت کا زور کم ہو رہا ہے۔ اور مشرکانہ اور کافرانہ طور طریقے مسلم معاشرے میں بھی سرایت کر رہا ہے۔ اس کے خلاف ہمیں مثبت انداز میں جد و جہد کرنی چاہئے۔ میرے نزدیک اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ حالات جس قدر نامساعد ہوں گے۔ اسقدر لوگوں میں اسلام کی پیاس و تڑپ ہوگی۔ اس وقت اصل ضرورت اس بات کی ہے۔ کہ اسلام کو موجودہ تمدنی، عمرانی اور اقتصادی مسائل کو پیش نظر رکھ کر اس طرح پیش کیا جائے کہ آج کی دکھی انسانیت کا حل صرف اسلام اور صرف اسلام میں نظر آتا ہے۔ ہمیں کسی دوسرے افکار اور نظریات سے کوئی چیز مستعار لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام ہی تمام مسائل کا حل ہے۔

علماء کرام کا نائب رسول ﷺ کے منصب پر فائز ہونے کا اصل تقاضا یہ ہے کہ وہ خود رہنما بنیں اور کسی بھی تحریک کے محض ترجمان نہ بنیں، بلکہ لوگ ان کی رہنمائی اور قیادت میں اسلام کی منزل مطلوب کی طرف پیش قدمی کریں۔ مولانا محمود الحسنؒ کے انتقال کے بعد بدقسمتی سے میرے نزدیک علماء یہ فرض انجام نہیں دے رہے ہیں۔ وہ کسی طرف ہوں ان کی حیثیت محض ایک Camp Follower [illegible] کی ہے۔ اس صورت حال سے علماء کرام کو نکلنے کی ضرورت ہے۔

علماء کرام اگر براہ راست خود مغربی افکار و نظریات کا مطالعہ کریں تو وہ وقت کی اہم ضرورت اور زمانے کے چیلنج کا مثبت جواب دے سکتے ہیں۔ آج عالم انسانیت ایک نئے نظریۂ زندگی کیلئے متلاشی ہے۔ اس خلاء کو صرف مسلمان ہی علماء کرام کے تعاون سے پر کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق دے اور خدا کرے کہ پاکستان میں صحیح معنوں میں اسلامی حکومت

خلفائے راشدہ کے اصولوں کے مطابق قائم ہو۔ فقط والسلام۔ ابصار عالم رستم ہو یونیورسٹی حیدرآباد۔

ضروری تصحیح مفتی امجد العلی صاحب کے مضمون اعضاء انسانی کی پیوندکاری کی تیسری قسط میں کتابت کی غلطی کی وجہ سے مضمون کے ص۳۳ تا ص۳۴ سطر بارہ تک لفظ "میتۃ" کو میت لکھا گیا ہے جبکہ صحیح میتہ ہے۔ نیز صفحہ ۳۴ کی سطر ۱۸ کی آخری سطر اور اس صفحہ کی سطر ۲۱ کے ابتدائی حصہ میں لفظ میت صحیح ہے۔ ان اغلاط کی اصلاح ضروری ہے۔ اسی طرح مضمون کی پہلی قسط میں ص۳۰ سطر ۱ میں حاصل ہوگا کی بجائے حاصل نہ ہوگا ہے۔ سطر ۱۷ میں لفظ اولاد اور ص۳۵ سطر ۴ میں والعین کے بعد بالعین رہ گیا ہے۔ ص۵۱ پر مبسوط کی روایت میں حاسد کی بجائے فاسد ہونا چاہئے۔

مشرقی پاکستان کے علماء و طلباء مشرقی پاکستان کے علماء و طلباء بدستور فوجی اسلحہ کی ٹریننگ لیکر باقاعدہ شرپسند لوگوں کی مدافعت کیلئے تیار ہو گئے ہیں۔ دشمنان ملک اور شرپسند عناصر نے مشرقی پاکستان کو بالکل تباہ کر دینے کیلئے مکمل تیاری کر لی تھی مگر ہماری پاک فوج کا مقابلہ وہ لوگ کب کر سکتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں وہ لوگ آتے ہی نہیں چور کی طرح ادھر ادھر چکر لگاتے ہیں۔ اور جانی مالی نقصان کیلئے وہ لوگ کوشاں رہتے ہیں۔ مگر خدا کے فضل و کرم سے وہ شرپسند عناصر دبتے جا رہے ہیں۔ انشاء اللہ مشرقی پاکستان انڈیا کے ہاتھ میں ہرگز نہیں جا سکے گا۔ یہاں کے احوال دیکھ کر علماء حضرات کی طرح سے جہاد کی ندا آ رہی ہے۔ کیونکہ وہ لوگ پاکستان اور اہل علم علماء کو ختم کر دینے کے لئے ہمہ تن کوشاں ہیں۔ (امین الحق محدث جبیت نگر عالیہ مدرسہ کشور گنج۔)

حج پالیسی پر نظر ثانی کیجئے حج بیت اللہ اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ ہمارے ملک میں ہزاروں مسلمان سالہاسال سے حج کی درخواستیں ہاتھ میں لئے در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ان کو کامیابی کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی بلکہ بعض بیچارے تو یہ حسرت اپنے دل میں لئے بے نیل مرام اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اگر ایک ادنیٰ مسلمان اپنے دینی فریضہ کی ادائیگی کے لئے عمر بھر کی پونجی قربان کرنے کیلئے تیار ہو سکتا ہے، تو اسلامی دنیا کی سب سے بڑی مسلمان مملکت کیلئے نہایت ضروری ہے۔ کہ وہ چند لاکھ روپے کا زرمبادلہ قربان کر کے ہزاروں مسلمانوں کے ایک اہم دینی فریضہ میں تعاون کرے۔ اندازہ یہی ہے کہ کوٹہ کی پابندی ختم کرنے کی صورت میں درخواست دہندگان کا ہجوم ایک دو سال بعد ختم ہو جائیگا۔ لہٰذا مرکزی حکومت سے درخواست ہے کہ وہ امسال حج پالیسی پر نظر ثانی کر کے کوٹہ کی پابندی ختم کرے اور تمام امیدواروں کی حج کی درخواستیں منظور کر کے ان کے ثواب حج اور انکی دعاؤں میں حصہ دار بنے۔

ملک کی موجودہ اقتصادی مشکلات کا ہمیں پورا احساس ہے لیکن حج جیسا دینی فریضہ ان سب سے

اہم ہے۔ نیز توقع ہے کہ اخبارات و رسائل، دینی اور سیاسی جماعتیں، ادارے اور دیگر احباب بھی حکومت کو اس مشترکہ دینی مقصد کی طرف متوجہ کر کے اپنا فرض ادا کریں گے۔ (فیض احمد - مجلس اشاعت المعارف ٹی بی ہسپتال روڈ - ملتان شہر)

معاشرتی برائیوں کے خلاف جہاد کیجئے | بعض قبائلی علاقوں اور پٹھانوں میں لڑکی کا روپیہ اور جائداد لینا فخر سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ نصِ قرآنی سے للذکر مثل حظ الانثیین ہے۔ لڑکی کا حصہ والد کی جائداد میں بھائی سے نصف ہے۔ سنا گیا ہے کہ بڑے بڑے عالم بھی اس مرض میں مبتلا ہیں۔ آپ الحق کے ذریعہ اس کے انسداد پر مضامین لکھیں۔ یہ ایک جہاد ہے۔

دیوبند کے مضافات میں بیوہ کا عقد ثانی جرم سمجھا جاتا تھا۔ مگر فانکحوا الایامیٰ کی نص اس کے خلاف تھی۔ دیوبند کے اکابرین میں سے غالباً حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اس کے خلاف جہاد شروع کیا مضافات میں تقریروں کا سلسلہ جاری کیا۔ آپ کی ہمشیرہ بہت بوڑھی اور سنِ یاس کو پہنچ چکی تھیں۔ وہ بیوہ تھیں، کسی نے بھرے جلسہ میں اٹھ کر کہا کہ آپ ہمیں بیواؤں کے نکاح کی ترغیب دیتے ہیں۔ حالانکہ آپ کی ہمشیرہ بیوہ آپ کے گھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔ پہلے اس کا عقد کرائیں پھر آکر ہمیں تلقین کریں۔ اسی وقت اپنے گھر آکر ہمشیرہ کے پاؤں پر پگڑی رکھ کر کہا کہ ایک مردہ سنت آپ کی وجہ سے زندہ ہو سکتی ہے۔ آپ اس کو زندہ کریں۔ پھر انہیں سارا واقعہ سنایا۔ اس نے کہا کہ میاں میں ساٹھ سال کو پہنچ چکی ہوں، میں کیا نکاح کروں گی۔ آپ نے اصرار کر کے منوالیا، اور اپنے ایک عمر رسیدہ معتقد سے نکاح کرا دیا۔ اور اسی مجلس میں جا کر یہ واقعہ سنایا۔ چونکہ اخلاص تھا اس کا یہ اثر ہوا کہ اسی مجمع میں بیشمار بیواؤں کا عقد کرایا گیا اور تمام علاقے میں اس کا رواج ہو گیا۔

اس لئے علماء حضرات کو چاہئے کہ معاشرتی برائیوں کے خلاف اپنے حلقہ ہی سے کام شروع کر کے جہاد فرمائیں۔ اور اپنے خطبات جمعہ وغیرہ میں مسلسل ان خرابیوں پر تنبیہ کریں۔ (حکیم محمد علی ذاروین گنج : گوجرانوالہ)

عالم کی وفات | استاذ العلماء مولانا محب اللہ لسوندی خطیب جنوبی وزیرستان نے ۱۲ ر جون ۱۹۷۱ قبل از نماز عصر بمقام زیارت بدر تحیۃ الوضوء پڑھتے ہوئے انتقال فرمایا۔ پشتو فارسی کے مشہور شاعر و ادیب تھے۔ تحریکِ آزادی اور غازی امان اللہ خان مرحوم کے بارہ میں انقلابی نظمیں لکھیں۔ ان کی وفات سے وزیرستان کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے۔ قارئین الحق سے رفع درجات کی دعا ہے۔ "ادارہ"

تبصرہ نگار : اختر راہی ایم اے

قرآن و سنت کی روشنی میں اسلامی فقہ
بزبان انگریزی
ISLAMIC JURISPRUDANCE IN THE LIGHT OF QURAN & SUNNAT

مؤلف : سید یعقوب شاہ صاحب۔
ناشر : فیروز سنز لمیٹڈ لاہور۔
قیمت : ۶/- روپے۔ جلد کارڈ بورڈ۔ طباعت عمدہ

سید یعقوب شاہ سابق آڈیٹر جنرل علمی حلقوں میں اپنے متجددانہ خیالات کی بدولت خاصے معروف ہیں۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے پراویڈنٹ فنڈ (جس میں سود بھی شامل ہوتا ہے) کے استعمال سے متعلق علمائے دین سے خط و کتابت کی اور کمرشل انٹرسٹ (تجارتی قرضوں کے سود) کی حلت پر زور دیا۔ علمائے دین نے قرآن و سنت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمایا مگر شاہ صاحب کے دل کی گرہ نہ کھل سکی، بلکہ گردشِ ایام کے ساتھ ساتھ ان کے متجددانہ خیالات پختہ ہوتے چلے گئے۔

شاہ صاحب نے اپنے متجددانہ خیالات کا اظہار اپنی دو اردو کتابوں "چند معاشی مسائل اور اسلام" اور "قوانینِ اسلامی کا نفاذ" میں کیا ہے۔ ان دونوں کتابوں کا خلاصہ زیرِ تبصرہ کتاب ہے۔

"اسلامی فقہ — قرآن و سنت کی روشنی میں" میں شاہ صاحب نے تعددِ ازدواج، طلاق ثلاثہ، انشورنس، کمرشل انٹرسٹ (تجارتی قرضوں پر سود) زکوٰۃ اور قطع ید و رجم وغیرہ سے بحث کی ہے۔ ان کی بحث کا سلسلہ وار خلاصہ یہ ہے کہ :

۱۔ عوام کے مفاد کیلئے تعددِ ازدواج پر پابندی کی اجازت ہے۔
۲۔ ایک ہی وقت میں کہی گئیں تین طلاقیں، ایک طلاق کی حیثیت رکھتی ہیں۔
۳۔ حکومت کے قرضوں اور منفعت بخش قرضوں پر سود "ربا" کے ضمن میں نہیں آتا۔
۴۔ انشورنس ایک حد تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔
۵۔ زکوٰۃ کو حکومت کے ٹیکسوں کے ساتھ شامل کیا جا سکتا ہے۔
۶۔ چوری کی سزا قطعِ ید زیادہ سے زیادہ سزا ہے۔
۷۔ رجم حد نہیں بلکہ تعزیر ہے۔
۸۔ ایسے تمام جانوروں کا گوشت کھانے کی اجازت ہے جن سے قرآن نے منع نہیں کیا۔

و بعض ترامیم کے ساتھ سوشلزم اپنایا جا سکتا ہے۔

شاہ صاحب نے قرآن و سنت کی واضح ہدایات کے علی الرغم جو نتائج اخذ کئے ہیں ان کی بنیادیں دو امور پہ ہیں۔ اولاً شاہ صاحب سنت کی فقہی حیثیت کے بارے میں یہ مسلک رکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ہی احکام کی کامل اطاعت لازمی ہے۔ جو قرآن کی تشریح کرتے ہیں۔ ان کی زندگی بحیثیت مجموعی ہمارے لئے قابل اتباع نہیں۔ وہ رقمطراز ہیں:

"نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فرائض قرآن کی تشریح و توضیح تک ہی محدود نہ تھے۔ بلکہ انہیں مسلم قوم کی تنظیم اور اسلامی ریاست کا نظم و نسق کرنا تھا۔ اس مقصد کے لئے انہیں قرآن کے پیش کردہ اصولوں کے ساتھ اپنے احکام کا اضافہ کرنا پڑا۔ آخر الامر سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہم ان احکام کے کس حد تک پابند ہیں۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو احکام پیغمبرانہ حیثیت سے دئے ہیں ان ہی کی مکمل اطاعت کی ہم سے توقع کی جاتی ہے ---------- نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود اشارہ کیا ہے، ان کے صرف وہی احکام واجب الاتباع ہیں جو قرآن کی پیروی میں ہیں یا قرآنی احکام کی تشریح کرتے ہیں۔"

ثانیاً شاہ صاحب کے خیال میں "فقہ کا جانا پہچانا اصول ہے کہ وقت کی تبدیلی سے احکام بدل جاتے ہیں۔" یعنی (تتغیر الاحکام بتغیر الزمان) شاہ صاحب نے بنیادی اصولوں کی توجیہات اپنے ذہنی پس منظر میں کی ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں خلاف قرآن و سنت تجاویز پیش کی ہیں۔

خشت اول چوں نہد معمار کج   تا ثریا می رود دیوار کج

اس مختصر تبصرے میں شاہ صاحب کے خیالات پر تعقیب ممکن نہیں۔ انشاءاللہ الحق میں ان کے اٹھائے ہوئے مسائل پر گفتگو کی جائے گی۔ ہم علمائے دین اور مفتی حضرات کیلئے کتاب کے مطالعہ کی پر زور سفارش کرتے ہیں۔ تاکہ وہ جدید ذہن کے انداز فکر سے آگاہ ہوں۔ اور تجدد پسندانہ نیز روشن خیالی کے پردے پھیلائی جانے والی بے دینی کا سد باب کر سکیں۔ اور قرآن و سنت کی روشنی میں جدید مسائل کا حل پیش کریں۔

فقہ الحدیث | مولف: مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ۔ کتابت و طباعت: شستہ۔ سرورق نفیس۔ قیمت درج نہیں ——— زیر نظر کتابچے میں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا سید

اصغر حسین مرحوم نے صحیح اور معتبر احادیث کی روشنی میں ایمان، وضو، غسل، متعلقات نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، نکاح، حلال و حرام، لباس، علاج معالجہ اور تجہیز و تکفین وغیرہ کے ضروری مسائل سے بحث کی ہے۔ مؤلف کا انداز تحریر دلنشین اور مؤثر ہے۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

بستان المحدثین | مؤلف: شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ۔ مترجم: مولانا عبدالسمیع دہلوی ناشر: کلام کمپنی مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی نمبرا۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ سرورق اعلیٰ۔ قیمت ۷/ روپے

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) کی متداول تالیف ہے۔ شاہ صاحب نے اس میں محدثین اور کتب حدیث کا جائزہ لیا ہے۔ اگرچہ عربی و فارسی میں محدثین کے چند دوسرے تذکرے بھی ہیں، مگر ہند و پاک میں جو شہرت بستان المحدثین کو حاصل ہے وہ کسی دوسری تالیف کو نہیں۔ چونکہ اصل کتاب فارسی میں تھی اس لئے اردو دان طبقہ شاہ صاحب کی اس گرانمایہ تالیف سے مستفید نہیں ہو سکتا تھا۔ مولانا عبدالسمیع مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے محنت اور عرق ریزی سے "بستان المحدثین" کو اردو کا جامہ پہنایا۔ اصل عبارت سے مطابقت کے باوجود "ترجمہ پن" غائب ہے۔ ترجمہ کے علاوہ بعض مقامات پر "ف" لکھ کر مترجم نے قابل قدر فوائد کا اضافہ کیا ہے۔ طلبائے حدیث کے لئے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

فتنۂ انکارِ حدیث | مؤلف: ظہیر الاسلام ظہیر۔ ناشر: مکتبہ پیام ملت ۲۲۲ ٹیکا پور کانپور نمبرا طباعت و کتابت: معمولی نیوز پرنٹ۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

پندرہ روزہ "پیام ملت" کا خاص شمارہ پیش نظر ہے۔ شمارے کا موضوع عنوان سے ظاہر ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں انگریزوں کی آمد سے جہاں دوسری قباحتیں پیدا ہوئیں۔ ان میں سے ایک فتنۂ انکارِ حدیث بھی ہے۔ انگریزوں نے سیاسی استحکام کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو دین سے برگشتہ کرنے کی خاطر پادریوں کی خدمات حاصل کیں اور ان لوگوں نے اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف افترا پردازی کا طوفان کھڑا کر دیا۔ احادیث پر بھی انہوں نے اعتراضات وارد کئے۔ غیر مسلم مستشرقین نے علم دوستی کے لبادے میں احادیث کی حیثیت کو مجروح کرنے کی کوشش کی۔ مرعوب زدہ ذہنوں نے عیسائیت اور عیسائیوں کے سیرت و کردار کا پوسٹ مارٹم کرنے کی بجائے مجرم کی طرح اپنی صفائی پیش کرنا شروع کر دی۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کر کے دین کے ایک تاگزیر جزو کو خیرباد کہہ دیا۔ آج بھی ان کے فکر و خیالات کے

پیروکار احادیث کو قانونی حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں۔

مدیر "پیام ملت" نے حدیث کی حفاظت اور اطاعت رسول از روئے قرآن پر روشنی ڈالی ہے۔ اور منکرین حدیث کے پھیلائے ہوئے شبہات کی عقلی اور تاریخی طور پر غلطی واضح کی ہے۔

انوار السنن (مترجم) | مؤلف: قاضی شمس الدین علوی ناشر: دار العلوم عبیدیہ بلاک ۳۔ ڈیرہ غازی خان۔ کتابت طباعت: گوارا۔ کاغذ سفید۔ سرورق معمولی۔ قیمت ۵/- روپے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی شافعی (م ۸۵۲ھ) نے احکام سے متعلق مجموعہ احادیث "بلوغ المرام" مرتب کیا۔ مؤلف موصوف نے زیر نظر کتاب "بلوغ المرام" کے انداز پہ حنفی نقطۂ نظر سے مرتب کی ہے۔ احادیث کے انتخاب کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ ایمان سے لیکر عائلی زندگی کے مسائل تک کو احاطہ کیا گیا ہے۔ مسائل متفرقہ میں متنوع پہلو پیش پیش کئے گئے ہیں۔

مؤلف نے افادۂ عام کی خاطر اصل عربی متن کے ساتھ اردو ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔ ترجمہ سے کتاب کی قدر و قیمت دوچند ہو گئی ہے۔ ترجمہ مرہانہ ہے اور مزید اصلاح کا محتاج۔ مرتب نے جا بجا فوائد بھی لکھے ہیں۔ مگر ان فوائد میں تحزب اور گروہ بندی کے جراثیم موجود ہیں۔ "اختلاف امتی رحمۃ" کے مصداق عالمانہ اور سنجیدہ اختلاف موزوں اور مناسب ہے۔ مگر تحزب اور گروہیت درست نہیں۔ اس خامی کے قطع نظر مؤلف نے ترتیب احادیث میں سلیقے سے کام لیا ہے۔ اور ان کی یہ کوشش قابل قدر ہے۔

بستان العارفین (اردو) | تالیف: امام ابو زکریا محی الدین نوویؒ۔ مترجم: حامد الرحمن صدیقی کاندھلوی۔ طباعت عمدہ۔ مجلد۔ سرورق خوبصورت۔ قیمت: چار روپے پچاس پیسے۔

محی الدین ابوزکریا یحییٰ بن شرف الدین نووی (م ۶۷۶ھ) "شرح صحیح مسلم" "ریاض الصالحین" اور "اربعین نووی" جیسی معروف اور متداول کتب حدیث کے مؤلف ہیں۔ ان کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ زیر نظر تالیف "بستان العارفین" بھی ان سے یادگار ہے۔ کتاب چار ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں نیت اعمال کی اہمیت، اخلاص و صدق کی حقیقت اور علم نافع کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ دوسرا باب علم نافع سے متعلق آئمہ کرام کے قیمتی اقوال سے مزین ہے۔ تیسرا باب اولیاء کے اوصاف اور ان کی کرامات کے لئے وقف ہے۔ آخری باب میں دلچسپ حکایات درج ہیں۔ مختصر یہ کہ امام نوویؒ نے کتاب میں تصوف، اخلاق اور اعمال کے بارے میں عمدہ اور دلچسپ لطائف و اقوال اور مشائخ کرام کے مناقب و واقعات لکھے ہیں۔ مترجم

مولانا حامد الرحمٰن صدیقی نے سلاست کلام کا خیال رکھا ہے۔ اور قیمتی حواشی لکھ کر کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا ہے۔ ابتداء میں نو صفحات پر پھیلا ہوا مقدمہ امام نووی کی حیات پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ کتاب بھی کلام کمپنی کی شائع کردہ ہے۔

انوار النظر فی آثار الظفر | (خود نوشت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی) ناشر: مرکزی مجلس حیات المسلمین ۴۹۔ مال روڈ لاہور۔ طباعت وکتابت گوارا۔ سرورق: خوبصورت۔ قیمت ۲/ روپے

زیر تبصرہ تالیف مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی کی خود نوشت ہے جو انہوں نے حسام اللہ شریفی کے سوالنامے کے جواب میں تحریر کی۔ مولانا نے اپنے خاندانی حالات، تعلیمی زندگی، علمی و تدریسی خدمات اور تحریک آزادی میں ذاتی جدوجہد پر روشنی ڈالی ہے۔ علمائے دیوبند کا ایک طبقہ مولانا اشرف علی تھانوی کے زیر ہدایت مسلم لیگ کی حمایت میں پاکستان کی تحریک میں شامل رہا ہے۔ چونکہ مولانا ظفر احمد عثمانی اس طبقے کے ایک اہم فرد ہیں۔ اس لئے مولانا کی بیان کردہ روایات تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ تحریک پاکستان کے طالب علموں کے لئے کتاب کا مطالعہ کئی ایک غلط فہمیوں کے ازالہ کا باعث ہوگا۔ مولانا ظفر احمد عثمانی نے قیام پاکستان کے بعد کے حالات پر بھی سرسری گفتگو کی ہے۔ جس سے علماء کے مطالبات، طریق کار اور خدمات پر روشنی پڑتی ہے۔

مسلمان خاوند | مؤلف: مولانا محمد ادریس انصاری۔ ناشر: کلام کمپنی مقابل ندوی مسافر خانہ کراچی نمبر ۱۔ طباعت وکتابت موزوں۔ قیمت درج نہیں۔

مغربی تہذیب و تمدن کے اثر و نفوذ سے ہماری زندگی کا کوئی گوشہ محفوظ نہیں۔ ہماری عائلی زندگی میں اس کے تباہ کن اثرات سامنے آرہے ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ ہم اللہ اور رسول کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کریں۔ آج ہمارے گھروں کا سکون لٹ چکا ہے۔ اور نئی پود دینی روایات سے بے بہرہ ہے۔ اس کا ایک اہم سبب ہماری عائلی زندگی کا بگاڑ ہے۔ عائلی زندگی کی تلخیاں بچوں کی سیرت پر انمٹ نقوش چھوڑتی ہیں۔ یہ بڑے ہو کر موزوں شہری نہیں بن سکتے۔ گھریلو زندگی استوار ہے والدین کے باہمی تعلق پر۔ اور مسلمان کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عائلی زندگی ایک روشن قندیل ہے جس سے اکتساب نور کرنا ہمارا فریضہ ہے۔ مؤلف نے زیر تبصرہ کتاب میں احادیث کی روشنی میں مسلمان خاوند کے فرائض اور ذمہ داریاں بتائی ہیں۔ ایسی اصلاحی کتاب کا مطالعہ موجب اصلاح ہے۔ فاضل مؤلف بروقت اقدام کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

قصیدہ نعتیہ یمن (مترجم) | مؤلف: عمر زالجنی۔ اردو ترجمہ و عربی شرح: مولانا رحمت اللہ خان

ساحی مرحوم ۔ کتابت و طباعت نفیس ۔ جلد کارڈ بورڈ ۔

کہا جاتا ہے کہ زیرِ نظر قصیدہ عمرو الجنی ایک جن کی کاوشِ طبع کا نتیجہ ہے۔ اور اہلِ علم کی ایک خاصی تعداد قصیدہ کو جن کی تخلیق ہی قرار دیتی ہے۔ تاہم اگر یہ بات متحقق نہ بھی ہو تو نفسِ مضمون کے لحاظ سے قصیدہ عربی شعر و ادب کا شہ پارہ ہے۔ اور اہلِ ذوق کی تسکین کا باعث مولانا رحمت علی خان ساحیؒ نے رواں، سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ کیا ہے۔ اور عربی شرح لکھی ہے۔ ناشر نے طباعت میں حسنِ ذوق کا ثبوت دیا ہے۔

فریب خوردہ شاہین | مرتب: مولانا ابو احمد عبداللہ صاحب ۔ ناشر: مولانا عبدالواسع ناظم نشر و اشاعت ادارۂ نعمانیہ رجسٹرڈ گوجرانوالہ ۔ جلد کارڈ بورڈ ۔ ٹائیٹل پیج سادہ ۔ صفحات ۲۸۴، قیمت درج نہیں ــــــ ادارۂ نعمانیہ کے سلسلہ تبلیغ کی یہ چوبیسویں کتاب ہے۔ مرتّب نے زیرِ نظر کتاب میں مغربی اقوام کی اسلام دشمنی اور ان کی خطرناک چالوں سے پردہ اٹھانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ ملک کے مغرب زدہ طبقے کو مغربی اقوام کی اصل تصویر دکھائی ہے کہ آزادیٔ اظہار کا واویلا مچانیوالوں نے کسطرح بے گناہ انسانوں کو ذبح کیا۔ ایک ماہر طبیعات "برونو" کو اس جرم کی پاداش میں زندہ آگ میں جلا ڈالا گیا کہ وہ اس کائنات کے علاوہ دوسری دنیاؤں کا قائل تھا۔ گیلیلو کو اسلئے جیل کی ہوا کھانا پڑی کہ وہ زمین کے گول ہونے پر یقین رکھتا تھا۔

جان ولیم ڈریپر نے CONFLICT BETWEEN RELIGION AND SCIENCE. کے نام سے کتاب لکھی تھی جس کا ترجمہ برصغیر پاک و ہند میں مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔ مصنف نے اس کتاب میں آغازِ عالم سے لیکر موجودہ صدی تک تمام قابلِ ذکر مذہبی تحریکوں، علوم و فنون کی ایجاد اور ان کے پیدا کردہ تغیرات پر بحث کی ہے۔ ان تمام امور پر بارہ ابواب میں بحث کی گئی ہے۔ "فریب خوردہ شاہین" کا اصل متن اس کتاب کی تلخیص ہے۔ ڈریپر کے بارے میں مصنف کی رائے یہ ہے کہ :

> "مصنّف کتاب (معرکۂ مذہب و سائنس) منصف مزاج، غیر متعصب اور غیر جانبدار ہیں۔ کسی غلطی یا غلط فہمی کا شکار ہو جانا یا سہو و نسیان کا مرتکب ہو جانا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ لیکن موصوف نے جہاں تک ہمارا حسنِ ظن ہے۔ دیدہ و دانستہ کوئی غلط بات پیش نہیں کی" صـ ۲۲

کتاب قابلِ قدر ہے۔ اور فریب خوردہ شاہینوں کے علاوہ عوام بھی اس سے بخوبی استفادہ کر سکتے ہیں ــــــ۔

---★---★---★---